# رثائیاتِ
# علامہ طالب جوہری

ترتیب وتدوین:

**فرحان رضا**

# رثائیاتِ

# علامہ طالب جوہری

علامہ طالب جوہری کا رثائی کلام ورثائی ادب پر لکھی گئی تحریریں

maktabah.org

ترتیب وتدوین:

فرحان رضا

☆ جملہ حقوق محفوظ ☆

خانوادۂ آیت اللہ علامہ طالب جوہری صاحب قبلہ

کتاب کا نام: رثائیات علامہ طالب جوہری

ترتیب و تدوین: فرحان رضا

سنِ اشاعت: ماہِ جولائی ۲۰۲۰ء

تعداد: ۵۰۰

قیمت: ۶۰۰ روپے

پیشکش: فروغِ مرثیہ انٹرنیشنل

کمپوزنگ: عدیل عباس، ناظم آباد، کراچی

طابع: پرنٹ ایکسپرٹ، کراچی۔ فون: 021-36708174

ملنے کا پتہ:

B-67، نیو رضویہ سوسائٹی، اسکیم ۳۳، کراچی، پاکستان

maablib.org

# انتساب

خانوادۂ آیت اللہ مولانا محمد مصطفیٰ صاحب جوہر اعلی اللہ مقامہ

maablib.org

مفہوم کی بہار، معانی کے شاخسار
الفاظ کے جبال، کنایوں کے آبشار
زورِ بیاں کے دشت، زباں آوری کی غار
افکار کی نبرد، صنائے کی کار زار

دنیائے شعریت ہے مسدس میں کیا نہیں
وہ اصطلاحِ فن میں مگر مرثیہ نہیں

گو زیرِ بحث آئیں علومِ معاشرت
لیکن اصولِ دیں سے ہو اُن کی مفاہمت
اسلوبِ پیشکش میں رہے طرزِ مرثیت
چھائی رہے مزاجِ سخن پر حسینیت

دین و ادب کے بیچ کی سرحد ہے دوستو
یہ درس گاہِ فکرِ محمدؐ ہے دوستو

(وجودِ باری تعالیٰ)

# رثائیات

## علامہ طالب جوہری

### علامہ طالب جوہری کا رثائی کلام و رثائی ادب پر لکھی گئی تحریریں

### فہرست مضامین


| | | |
|---|---|---|
| حرفِ آغاز | مولانا امجد رضا جوہری | ۹ |
| عرضِ مرتب | فرحان رضا | ۱۳ |
| رثائیات و انتقادیاتِ علامہ طالب جوہری | افتخار عارف | ۱۷ |
| نظمِ جوہری | ڈاکٹر محمد رضا کاظمی | ۱۹ |
| رثائی ادبیات میں علامہ طالب جوہری کی وسیع النظری (چند ادبی پہلو) | ڈاکٹر ہلال نقوی | ۲۸ |
| حضرت علامہ طالب جوہری کے مرثیے (خواندگی کے حوالے سے) | سید جاوید حسن | ۳۱ |
| مرثیہ، منبر اور فروغِ مرثیہ | سید اصغر مہدی اشعر | ۳۹ |


## حصہ نظم

منقبت:


۱۔ اے امیرِ ابد، اے سفیرِ ازل، العجل العجل ۴۲


سلام:


۱۔ جز علیؑ ہوتا اگر بعدِ پیمبرؐ دوسرا ۴۴

۲۔ دشتِ بلا میں کوثر والے کب محتاج تھے پانی کے ۴۶

۳۔ جو بھی میرے مرتضیٰ کی شان ہے ۴۷

۴۔ جو بھی راہِ علم و عمل میں پیروِ فکرِ بوذر ہوگا ۴۹

۵۔ ہم کو کرسی نہ جاہ و حشم چاہیئے ۵۱

**مرثیے:**

۱۔ مرثیہ اول: عنوان: وجودِ باری — سنِ تصنیف

مطلع: جب کُن ادا کیا لبِ حکمت خطاب نے ۱۹۶۸ء ۵۲

۲۔ مرثیہ دوم: عنوان: ہدایت

مطلع: اے فکرِ جواں صفحۂ دانش پہ رقم ہو ۱۹۹۶ء ۷۱


# حصہ نثر

**تقاریظ و تبصرے:**


| کتاب | شاعر / مصنف | سنِ اشاعت | |
|---|---|---|---|
| ۱۔ انجم | علامہ نجم آفندی | ۱۹۷۷ | ۹۳ |
| ۲۔ مراثیِ فیض | فیض بھرت پوری | ۱۹۷۹ | ۹۴ |
| ۳۔ سربکف | صبا اکبرآبادی | ۱۹۸۰ | ۹۸ |
| ۴۔ سرِ نینوا | اُمید فاضلی | ۱۹۸۴ | ۹۹ |
| ۵۔ خوں ناب | صبا اکبرآبادی | ۱۹۸۵ | ۱۰۲ |
| ۶۔ جلتے خیمے | ثاقب مظفرپوری | ۱۹۸۶ | ۱۰۳ |
| ۷۔ والعصر | شاہد نقوی | ۱۹۸۷ | ۱۰۵ |
| ۸۔ لہو لہو کہکشاں | شاہد نقوی کے مرثیہ سے قبل مرثیہ پر گفتگو | ۱۹۸۸ | ۱۱۳ |
| ۹۔ کربِ جاوداں | شاہد نقوی | ۱۹۹۴ | ۱۱۵ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۰۔ کعبے سے کربلا تک | ساحر فیض آبادی | ۱۹۹۲ | ۱۲۰ |
| ۱۱۔ صراط و سلسبیل | شاہد نقوی | ۱۹۹۲ | ۱۲۳ |
| ۱۲۔ نقطۂ اعتدال | مشکور حسین یاد | ۱۹۹۳ | ۱۲۸ |
| ۱۳۔ لواء الحمد | مولانا حسن امداد | ۱۹۹۴ | ۱۳۹ |
| ۱۴۔ ارمغانِ جمیل | علامہ جمیل مظہری | ۱۹۹۵ | ۱۴۸ |
| ۱۵۔ گریۂ فرات | پروفیسر سردار نقوی | ۱۹۹۵ | ۱۵۹ |
| ۱۶۔ سجودِ خامہ | اسیر فیض آبادی | ۱۹۹۵ | ۱۶۵ |
| ۱۷۔ ردائے صبر | تصویر فاطمہ | ۱۹۹۶ | ۱۶۷ |
| ۱۸۔ لبِ کوثر | کوثر نقوی | ۱۹۹۸ | ۱۶۹ |
| ۱۹۔ نمازِ سخن | قسیم امروہوی | ۱۹۹۹ | ۱۷۱ |
| ۲۰۔ لوحِ مودت | سرفراز ابد | ۲۰۰۱ | ۱۷۲ |
| ۲۱۔ پرسہ | پروفیسر سردار نقوی | ۲۰۰۳ | ۱۷۴ |
| ۲۲۔ موت | راغب مرادآبادی | ۲۰۰۴ | ۱۷۵ |
| ۲۳۔ اسلوبِ تعزیت | شاداں دہلوی | ۲۰۰۵ | ۱۷۹ |
| ۲۴۔ میرا اثاثہ | آباد محمد زائر نقوی | ۲۰۰۵ | ۱۸۵ |
| ۲۵۔ معراجِ سخن | سخن فتحپوری | ۲۰۰۷ | ۱۹۲ |
| ۲۶۔ مرثیہ "الحمد" (غیر مطبوعہ) | ڈاکٹر ہلال نقوی کے تصنیف کردہ مرثیے کا پیش لفظ | ۲۰۱۳ | ۱۹۳ |
| ۲۷۔ درد کی قندیل | فراست رضوی | ۲۰۱۴ | ۲۰۰ |
| ۲۸۔ قصہ نصف صدی کا | اشرف عباس | ۲۰۱۸ | ۲۱۴ |

## علامہ طالب جوہری صاحب قبلہ کی تحریر سے اقتباس

میں نے سید آلِ رضا مرحوم کی مجلسِ ایصالِ ثواب سے خطاب کرتے ہوئے سورۂ شعراء کی آخری آیت کی روشنی میں شاعر کے لئے چار شرائط کا تذکرہ کیا تھا۔ ایمان، عمل صالح، بکثرت ذکرِ خدا اور نصرتِ مظلوم۔۔۔ اردو کے تمام اصناف میں مرثیہ وہ واحد صنف ہے جو ان تمام شرائط کو بیک وقت پورا کرتا ہے اس سے بڑھ کر اس صنف کی جلالت اور افادیت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔۔۔ اور یقیناً یہ تائید ایزدی ہے جس کے سبب یہ صنف اس قدر محتشم ہے اور مختلف ادوار میں عالم ادب کی رہنمائی کا بار اٹھاتی رہی ہے۔

maablib.org

# حرفِ آغاز

والدِ علام کی شاعرانہ شخصیت محتاج تعریف وتعارف نہیں اور ان کا پایۂ سخن ہر قسم کی توصیف سے بالاتر ہے۔ ان کی جدت طرازِ طبیعت نے رثائیات، غزل گوئی اور قصیدہ میں امتیازی شان پیدا کی ہے کہ انہیں صحیح طور سے صاحب طرز کہا جا سکتا ہے۔ حضرت علامہ کی جدت طرازی، خیالات کی بلند پروازی، معنی آفرینی اور مضامین کے اچھوتے پن کا ثبوت ان کے کلام میں جا بجا ملتا ہے اور حکمت اور کلام کے مباحث علامہ کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں جس کے سبب ان کی طبیعت وسیع مشرب ہے۔ حضرت علامہ کے پہلے مرثیے وجودِ باری کا بیشتر حصہ خواص کے لئے ہے اس کا سبب فلسفیانہ مباحث ہیں جو عام مذاق اور معمولی فہم کی دسترس سے بالاتر ہیں۔ تقریباً ہر ایک بند ان کے فلسفیانہ اور حکیمانہ انداز کا پرتو ہے یہ حکیمانہ اندازِ بیاں علامہ کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے اور پھر حسن یہ ہے کہ اس قسم کے مضامین کی فراوانی بھی ہے۔ بعض مبصرین کا قول ہے کہ فلسفہ شاعری کا کمزور کر دیتا ہے مگر حق یہ ہے کہ اگر زبان و بیان کی صفائی ملحوظِ خاطر رکھی جائے تو مشاق اور آزمودہ کار شاعر کا قلم اس سے بچ سکتا ہے۔

علامہ صاحب کے پہلے مرثیے کا مطلع ہے "جب کُن ادا کیا لبِ حکمت خطاب نے" اس مصرعے میں علامہ نے لبِ حکمت کی ترکیب لطیف سے ایک اہم ترین مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے، لبِ حکمت میں کُن کا ادا ہونا ہے کیا؟ آنکھ دیکھتی ہے، کان سنتے ہیں، زبان بولتی ہے، ناک سونگھتی ہے، ہاتھ لمس کرتے ہیں لیکن میں نے کبھی اپنی روح کو، اپنی آنکھ کو حکم دیتے نہیں دیکھا کہ دیکھ، اور اپنے کانوں کو حکم دیتے نہیں سنا کہ سُن، اس کا مطلب یہ ہے کہ روح کا ارادہ ہی اس کا قول ہے۔ اسی بات کی طرف پروردگارِ عالم نے سورۂ یٰسٓ میں ارشاد فرمایا: انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون۔ اللہ کا امر یہ ہے کہ پروردگار جب کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے "کُن" ہو جا "فیکون" اور وہ شے معرضِ وجود میں آجاتی ہے۔ یعنی ذاتِ باری کا ارادہ ہی اس کا قول ہے۔

اس نظمِ ہست و بود پہ ایمان چاہیے
ہنگامۂ وجود کا ایقان چاہیے
احساس اپنی ذات کا ہر آن چاہیے
یعنی خود اپنے نفس کا عرفان چاہیے

عرفانِ نفس حق کی گمرہی ہے
خود آگہی ابھر کے خدا آگہی ہے

اس بیت میں حضرتِ علامہ نے خودی سے خدا تک کے سفر کا اشارہ کیا ہے۔

نفس ایک مجرد شے ہے اور فلسفہ یونان کا ایک قدیم مقولہ ہے النفس فی الوحدة کلّ القوىٰ۔ نفس اپنی وحدت میں ساری طاقتیں ہے۔ اعضاء و جوارح کی بکھری ہوئی طاقتیں نفس کی منزل میں وحدت اختیار کر لیتی ہیں، جیسے ہم روز مرہ کے محاورے میں کہتے ہیں اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے، اپنے پیروں سے چل کر آیا ہوں، اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اپنے کانوں سے سنا ہے لیکن جب ان بکھری ہوئی طاقتوں کے نسبت اپنے نفس سے دیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ سارے افعال میں نے انجام دیئے۔ تو یہ جو نفس ہے وہ "میں" ہے۔ نفس اپنے ایک ہونے کے ساتھ ساری طاقتوں کا مصدر ہے۔ اب اگر ذاتِ باری ساری کائنات میں کسی کو اپنا نفس قرار دے تو وہ بھی اپنی وحدت میں ساری طاقتوں کا مخزن ہوگا۔

اس مرثیے میں حضرتِ علامہ کا فطری استدلال قدم بہ قدم پہ نمایاں ہے جس کی چند ایک مثالیں ان مصرعوں میں باآسانی دیکھی جا سکتی ہیں۔

ہر شے کی ابتداء ہے بفحوائے کاف و نوں
ہر چیز پر محیط ہے اعداد کا فسوں
با وصفِ احتیاج سوئے حرکت و سکوں
انکار ایک جہل ہے تشکیک اک جنوں

وقت و مکان و شکل و جہت کا اسیر ہے
منکر ہی خود وجودِ خدا کا سفیر ہے

یہ مرثیہ ۱۹۶۸ء میں لکھا گیا تھا جس میں منطقی استدلال اور فلسفیانہ براہان کے ساتھ ساتھ رثائی عناصر بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ حضرتِ علامہ کی ایک بیت ضرب المثل بن گئی، وہ بیت یہ ہے:

وہ حادثہ جو اک ابدی چیخ بن گیا
یعنی صریرِ خامۂ تاریخ بن گیا

اس مرثیے میں حضرت علامہ اجزائے مرثیہ گوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

گو زیرِ بحث آئیں علومِ معاشرت
لیکن اصولِ دیں سے ہو اُن کی مفاہمت
اسلوبِ پیشکش میں رہے طرزِ مرثیت
چھائی رہے مزاجِ سخن پر حسینیت

دین و ادب کے بیچ کی سرحد ہے دوستو
یہ درس گاہِ فکرِ محمدؐ ہے دوستو

اس کتاب میں حضرت علامہ کا دوسرا مرثیہ "ہدایت" بھی شامل ہے جس میں حضرت علامہ نے اپنے انتہائی پسندیدہ موضوع "امام زمانہ علیہ السلام" کے ذکر کو محور قرار دیا۔ یقیناً حضرت علامہ کا دوسرا تصنیف کردہ مرثیہ بھی رثائی ادب میں ایک عظیم اضافہ ہے۔

جناب فرحان رضا اس سے قبل آیت اللہ حضرت مولانا محمد مصطفےٰ جوہر اعلی اللہ مقامہٗ کی ذاتِ بابرکت پر "جوہر شناسی" جیسی وقیع و اہم کتاب ترتیب دینے کا شرف و افتخار رکھتے ہیں اور "شعریاتِ علامہ طالب جوہری" میں موجود مضامین کی جمع آوری میں بھی شریکِ کار رہے ہیں۔ جنابِ فرحان رضا کی جمع وتدوین کی یہ ادبی کاوش بھی "رثائیاتِ علامہ طالب جوہری" کی صورت میں قابلِ التفات ہے اور یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ موصوف نے جوہر شناسی سے رثائیاتِ علامہ طالب جوہری تک کا سفر نہایت خوش اسلوبی سے طے کیا ہے اور یہ سفر ابھی جاری ہے۔

پروردگار ان کی مساعیٔ جمیلہ کو قبول فرمائے۔

امجد رضا جوہری

خصوصی نوٹ:

رثائیاتِ علامہ طالب جوہری کے تمام مضامین اور کلام آیت اللہ علامہ طالب جوہری صاحب قبلہ کی حیات میں مکمل کر لئے گئے تھے اور اس کا مسودہ علامہ صاحب کو دکھا دیا گیا تھا اس لئے اس کتاب میں کسی تحریف یا اضافے کو مناسب نہیں سمجھا گیا۔

آیت اللہ علامہ طالب جوہری صاحب قبلہ کی خدمت میں
فرحان رضا ''رثائیاتِ علامہ طالب جوہری'' کا مسودہ پیش کرتے ہوئے۔

maablib.org

# عرضِ مرتب

تمام تعریفیں خداوندِ متعال کے نام اور دُرود و سلام محمدؐ و آلِ محمدؐ پر۔

بارگاہِ ایزدی میں شکرگزار ہوں کہ مجھے عالم وشاعرِ بے بدل علامہ طالب جوہری کے رثائی سرمایہ کو ترتیب دینے کا شرف و افتخار حاصل ہوا۔ شعریاتِ علامہ طالب جوہری ۲۰۱۴ء میں منصہ شہود پر آئی جس میں علامہ صاحب پر لکھے گئے مضامین ایک جگہ جمع کردیئے گئے تھے۔ اُسی وقت یہ طے ہوگیا تھا کہ شعریات کے بعد رثائیاتِ علامہ طالب جوہری ترتیب دی جائے گی جس میں علامہ صاحب کے تصنیف کردہ مرثیے، سلام اور رثائی کتابوں پر لکھی گئی تحریروں کو بھی ایک جگہ جمع کردیا جائے گا تاکہ تاریخ محفوظ ہوجائے۔ یہ وہ تحریریں ہیں جو رثائی ادب و شخصیات کی کتابوں پر لکھی گئی ہیں، پچھلے پچاس برسوں میں ہر بڑے مرثیہ نگار نے علامہ سے سندِ قبولیت کے لئے علامہ صاحب کی رائے کو اپنی کتاب کا جزوِ لازمی بنایا ہے۔

اس کتاب میں شامل کلام و مضامین کی جمع آوری کا آغاز ۲۰۱۶ء سے ہوچکا تھا مگر درمیان میں علامہ طالب جوہری قبلہ نے عزیزی مولانا امجد رضا جوہری اور خاکسار کو حکم دیا کہ اب یہ ذمہ داریاں آپ لوگ سنبھالیں، اُن کی مراد عالی جناب مولانا محمد مصطفےٰ جوہر صاحب قبلہ پر لکھے گئے مضامین اور شخصی مرثیوں پر مشتمل کتاب کی ترتیب کی ذمہ داری سے تھی۔ الحمدللہ قبلہ جوہر صاحب پر لکھے گئے مضامین اور شخصی مراثی فرزندِ جوہرؔی و میراثِ جوہرؔ محترم مولانا امجد رضا جوہری کی رہنمائی و مشاورت سے کتاب ''جوہر شناسی'' کی صورت میں ۲۰۱۸ء میں آپ تک پہنچ چکے ہیں اور اب دو سال کی تاخیر کے بعد ''رثائیاتِ علامہ طالب جوہری'' آپ کے ذوقِ مطالعہ کو جلا بخشنے کے لئے آپ کے دستِ مبارک میں موجود ہے۔

درحقیقت مندرجہ ذیل سطریں اپنی بے بضاعتی، کم مائیگی و کم علمی کے اعتراف کا احساس

ہونے کے باوجود بغرضِ استفادۂ علمی کے ایک طالب علمانہ کوشش ہے کیونکہ عہدِ حاضر میں حضرت علامہ طالب جوہری جیسی مجمع الصفات شخصیت کوئی دوسری نہیں جس کا اتنا کثیر علمی و ادبی سرمایہ ہو۔اور مجھ طالب علم کے پاس نہ تو اتنا علم ہے نہ الفاظ کہ جو علامہ پر گفتگو کے شایانِ شان ہوں۔

ہم علامہ صاحب کی شخصیت کی کس جہت کا ذکر کریں۔اگر قرآن فہمی کی بات ہو تو ایک عالم فہم القرآن کے سحر میں گرفتار رہا اور پوری دنیا پر باور ہوا کہ مسلمانوں میں ایسا صاحبِ علم موجود ہے جو قرآنی مسائل وعلوم کو اتنی آسانی سے سننے والوں کے اذہان تک منتقل کر دیتا ہے۔مفسرِ قرآن ایسا کہ ''احسن الحدیث'' گواہی دے۔منطق و فلسفہ کا ذکر ہو تو ''عقلیاتِ معاصر'' عقلِ سلیم کو دعوت دے۔علمِ معاشیات پر گفتگو ہو تو ''اسلامی معیشت کے رہنما اصول'' اقتصادی علوم پر بحث کرتی نظر آئے۔مستند مقاتل کا تذکرہ ہو تو ''حدیثِ کربلا'' واقعاتِ کربلا کے اسرار و رموز بتانے کے لئے موجود ہو۔خلفائے اثناعشر کا ذکر کریں یا کثیر تعداد میں عشرہ مجالس کے کتابی صورت میں مجموعوں کا ذکرِ خیر کریں۔غرض علم و فضل کو فلسفہ و منطق کے دفتر اجرِ طالب کی صورت میں جزائے جوہری کا سامان ہوں۔

علامہ صاحب فرماتے ہیں

حیراں نہ ہوں شعروں میں اگر جان نہیں ہے
یہ شوق ہے میرا مری پہچان نہیں ہے

صرف شوق ہونے پر اور بہت کم وقت شعر و سخن کی آبیاری میں صرف کرنے کے باوجود حرفِ نمو، پسِ آفاق اور شاخِ صدا جیسے شعری مجموعے چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ اگر واقعی علامہ صاحب صرف شاعری کو وقت دیتے تو یہ سرمایہ اور کتنا کثیر ہوتا۔رثائی سرمایہ میں دو مرثیے ''وجودِ باری تعالیٰ'' اور ''ہدایت'' موجود ہیں۔اور یہ شعری سرمایہ صرف وہ ہے جو اس کتاب میں شامل ہے، علامہ صاحب کے قصائد ایک علیحدہ موضوعِ گفتگو ہیں۔اور قصیدوں کے ذکر کے لئے ایک علیحدہ کتاب درکار ہے۔

اس کتاب میں علامہ صاحب کے تصنیف کردہ دو مرثیے، پانچ سلام اور ایک منقبت شامل ہے۔

مرثیوں کا اجمالی خاکہ درج ذیل ہے:۔

مرثیہ اول:

۱۔ عنوانِ مرثیہ: وجودِ باری تعالیٰ

۲۔ موضوع: توحید

۳۔ سنِ تصنیف: ۱۹۶۸ء

۴۔ سنِ اشاعت: ۱۹۹۵ء

۵۔ کتاب کا نام: صبرِ بیکراں

۶۔ کل بند: ۵۴

۷۔ مطلع: جب گُن ادا کیا لبِ حکمت خطاب نے

مرثیہ دوم:

۱۔ عنوانِ مرثیہ: ہدایت

۲۔ موضوع: امامِ زمانہؑ

۳۔ سنِ تصنیف: ۱۹۹۶ء

۴۔ سنِ اشاعت: ۱۹۹۸ء

۵۔ کتاب کا نام: رثائی ادب (سہ ماہی رسالہ، مرتب: ڈاکٹر ہلال نقوی)

۶۔ کل بند: ۸۴

۷۔ مطلع: اے فکرِ جواں صفحۂ دانش پہ رقم ہو

اس کے علاوہ ۱۹۷۷ سے اب تک علامہ صاحب نے جتنے مرثیہ نگاروں وشعراء کے مجموعۂ کلام پر تقاریظ وتبصرے(۱) تحریر فرمائے ہیں جو کہ بذاتِ خود ایک شاہکار قرار دیئے جاسکتے ہیں انہیں محفوظ کرلیا ہے۔ ان تبصروں کو سنِ اشاعت کی ترتیب کے ساتھ شامل کیا گیا ہے تاکہ قارئین کے لئے آسانی ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ علامہ کی تحریروں کو جمع کرنا انتہائی دشوار امر تھا اور یقیناً ابھی بھی کچھ تحریریں شامل نہیں ہو سکی ہوں گی جن کے لئے پیشگی معذرت کی جاتی ہے۔

---

(۱) [illegible]

ان تمام تبصروں میں علامہ صاحب نے صرف تعریف وتوصیف نہیں کی بلکہ اپنے شعری شعور، رثائی ادب میں قرآن فہمی اور تاریخی حقائق کے جاننے کی اہمیت پر بھرپور گفتگو کی ہے۔ سب سے اہم بات کہ جہاں جہاں انہوں نے شاعر سے اختلاف کیا ہے اُسے واضح طور پر لکھا ہے جو کہ ان تبصروں کا نچوڑ ہے۔ ان تقاریظ وتبصروں کے حوالے سے معروف شاعر رغب مرادآبادی اپنی رباعیات کی کتاب ''موت'' میں کہتے ہیں۔

ہے موت کا آپ اپنی نظر میں ہر طور
ہیں جوہری پرکھا ہے یہ ہیرا فی الفور
تقریظ علامہ طالب پڑھیے
اہلِ ادب و علم و ہنر آپ بغور

اس کتاب کے سلسلے میں مولانا امجد رضا جوہری کی ہر ممکن مدد کا میں شکر گزار ہوں کہ اگر وہ رہنمائی نہ فرماتے تو شاید یہ کام سہل نہ ہوتا۔ اس کے ساتھ ساتھ استاد محترم سید جاوید حسن، ڈاکٹر محمد رضا کاظمی اور ڈاکٹر ہلال نقوی کے بروقت مشورے میرے لئے آسانی فراہم کرتے رہے۔ عزیز دوست اور فروغ مرثیہ انٹرنیشنل کے بانی اصغر مہدی کے لئے بھی خصوصی دعائیں جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت کو اپنے ذمے لیا۔

سب سے آخر میں اپنی فیملی اور بالخصوص اپنے بیٹوں مصطفےٰ وعباس کا شکر گزار ہوں کہ ان کا شعرو ادب سے ذوق وشوق اور مجھ سے مزید کتابوں کا تقاضہ میرے سفر کو مہمیز کرتا ہے۔

از

فرحان رضا ۲۸ دسمبر ۲۰۱۹

maablib.org

# رثائیات و انتقادیاتِ علامہ طالب جوہری

تمام عالم اسلام میں بالخصوص کتب محمدؐ و آل محمدؐ کے ماننے والے جو کہ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور اردو زبان سمجھنے بولنے والے ہیں عظیم المرتبت، خطیب بے مثال، مفسر قرآن و حدیث، علومِ اسلامی پر حیرت انگیز دسترس رکھنے والے اسکالر، صاحب اسلوب شاعر و ادیب علامہ طالب جوہری اعلیٰ کے سحر میں گرفتار ہیں۔ علامہ طالب جوہری آیت اللہ حضرت مولانا محمد مصطفےٰ جوہر طاب ثرہ کے خانوادہ میں علم و دانش کی مستحکم و معتبر روایتوں کے امانت دار ہیں۔ حضرت علامہ طالب جوہری نے ساری زندگی علوم آل بیتؑ کی تبلیغ و ترویج میں گزاری اور ان کے خطبوں اور تقریروں کا ایک یادگار ذخیرہ موجود ہے جس سے آنے والی صدیوں تک کے لوگ استفادہ کرتے رہیں گے۔

اہل علم علامہ طالب جوہری کی تصنیفات و تالیفات سے بخوبی واقف ہیں۔ علامہ کی شخصیت بحیثیت مفسر قرآن، فلسفی و دانشور، ماہر علم کلام اور اسلومِ اسلامیہ کے حوالے سے زیادہ تذکرہ میں رہی جس کی وجہ سے ان کی شاعری و تنقیدی کام عمومی سطح پر شایانِ شان طریقے سے عوام تک متعارف نہ ہو سکا۔

انتہائی طمانیت کی بات یہ ہے کہ علامہ طالب جوہری کی شخصیت کے شعری و تنقیدی زاویہ پر ہمارے نوجوان تحت اللفظ خواں و ادیب ساتھی فرحان رضا نے ''رثائیاتِ علامہ طالب جوہری'' کے عنوان سے ان کی طویل عرصہ میں لکھی ہوئی ادبی تحریروں کو یکجا کر دیا ہے۔ فرحان سلمہٗ کو آیت اللہ مولانا محمد مصطفےٰ جوہر صاحب قبلہ کی شخصیت پر کتاب ''جوہر شناسی'' ترتیب دینے کا بھی شرف حاصل ہے۔

جیسا کہ کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے کہ ہمارے عہد کے نامور سخن وروں کی تخلیقی، رثائی و ادبی خدمات کے حوالے سے سپردِ قلم کیے جانے والے یہ مضامین ایک بہت اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان پر نظر ڈالنے سے آپ کو پاکستان کی تہذیب عزاداری اور اردو مرثیہ کے مختلف ادوار کے رجحانات کو سمجھنے و پرکھنے میں آسانی ہوگی۔ اس کے بعد ادبی تنقید سے ہٹ کر یہ تخلیقی نقد شعر قارئین کو

استفادہ، اکتساب اور انتقاد کے نئے راستے دکھاتی ہے اور قاری کو اصل متن سے رجوع کرنے اور توجہ سے مطالعہ پر مجبور کرتی ہے۔ان رثائی تحریروں کے علاوہ اس کتاب میں علامہ کے دو مرثیے "وجودِ باری تعالیٰ" اور "ہدایت" کے علاوہ کچھ سلام و منقبت بھی شامل ہیں جس کے ذریعے قاری علامہ طالب جوہری کی شخصیت کے رثائی پہلو سے متعارف ہوتا ہے کہ علامہ صاحب نے کس طرح اردو مرثیے کو برتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان مرثیوں کے مطالعے کے بعد میری طرح آپ بھی اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ علامہ طالب جوہری کے مرثیے میں روایتی مضامین اور زبان و بیان کے انحراف کے ساتھ ساتھ فکری اضافت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔"رثائیات علامہ طالب جوہری" ہر حوالے سے ایک وقیع اضافہ قرار دی جاسکتی ہے۔

افتخار عارف

maablib.org

# نظمِ جوہری(۱)

عزاداری کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ کبھی علمائے عظام مرکزِ نگاہ بنے ہیں اور کبھی شعرائے کرام۔ جب خاندانِ انیسؔ کے شعراء فردوس کو بسانے لگے اور مرثیہ تقلید کے دور سے گزرنے لگا تو علماء کے مواعظ نے جمہور کو زیادہ متوجہ کرنا شروع کر دیا۔ شمس العلماء مولانا سبط حسن اعلی اللہ مقامہٗ نے مواعظِ حسنہ کو ایک ادبی شان سے نوازا۔ علامہ رشید ترابی مرحوم و مغفور کے انتقال کے بعد تک مرثیہ گو شعراء کا دائرۂ اثر علماء کے مقابلے میں محدود تر ہے۔

ظاہر ہے وحدتِ مقصد کے باوجود نثر کی دنیا نظم سے زیادہ وسیع ہے اور ظاہر ہے کوئی زبان علمی ترقی کے مدارج اسی وقت طے کرتی ہے جب اس کی نثر ترقی کرتی ہے۔ اردو میں بھی یہی صورتِ حال موجود ہے۔ باوجود اس کے کہ ہماری ثقافت نظم کو وہ آزادی دیتی ہے جو نثر کو نہیں دیتی۔ پھر بھی ہمارے یہاں شاعری کے مستقل دبستان ملتے ہیں۔ فلسفے کے نہیں۔

یورپ کے برعکس، اسلامی معاشرے میں فلسفہ مذہب کا تابع رہا ہے، اور ہمارے یہاں فلاسفہ کی انفرادیت اپنی نوعیت میں تنقیدی ہے تخلیقی نہیں۔ شاعری کو انفرادیت کے زیادہ مواقع نصیب ہوئے ہیں مگر وہاں بھی تنظیم کے فقدان نے اسے تہی مایا بنا رکھا ہے۔

حجۃ الاسلام علامہ طالبؔ جوہری صاحب اپنی علمی حیثیت میں قوم کا سرمایہ بن چکے ہیں۔ انہوں نے بعض فکری مسائل کے اظہار کے لئے نظم کا انتخاب کیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق ان کے شعری سرمائے میں دو مکمل اور ایک نامکمل مرثیے شامل ہیں۔ میں فقط ایک مرثیہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہوں جس کا عنوان "وجودِ باری تعالیٰ" ہے۔ یہ مرثیہ ۱۹۶۸ء کی تصنیف ہے۔ اس مرثیہ کا موضوع نہ فلسفے کے لئے نیا ہے اور نہ شاعری کے لئے۔ مگر آج تک کسی اتنے موقر عالمِ دین نے زبانِ شعر سے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔

---

(۱) نظمِ جوہری، ڈاکٹر محمد رضا کاظمی کی کتاب "جدید اردو مرثیہ" ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا اور ان کی اجازت سے اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

محترم ہلال نقوی صاحب نے پاکستان کے ممتاز ترین مرثیہ نگاروں سے یہ سوال کیا تھا: ''کیا مرثیہ گو شاعر ہونے کے لئے عالمِ دین ہونا ضروری ہے؟'' اس سے ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا عالمِ دین کے لئے شاعر ہونا ممکن ہے؟ علامہ طالبؔ جوہری کا زیرِ نظر مرثیہ اس سوال کا جواب ہے۔

یہ مرثیہ موضوع کے لحاظ سے لازماً حمد کے دائرے میں آتا ہے اور حمد کے لئے محض کلام و استدلال سے شاعری کا حق ادا کرنا بہت مشکل ہے۔ اوجؔ اور شادؔ کی مثال سامنے کی مثال ہے۔ طالبؔ جوہری سمجھتے ہیں کہ صمدیت ایک ایسی کیفیت ہے جو اپنی وسعت میں ہیبت ناک ہے۔ اگر اس کیفیت کا حصول شاعر کے لئے سہل ہوتا تو شاید قرآن حکیم میں جہاں شعراء پر تعریض کی گئی وہاں ذکرِ خدا کی گنجائش نہ رکھی ہوتی۔ شاعر کا ذریعۂ وجدان اس کا حادث وجود ہے۔ شعورِ صمدیت سے نسبت، وجود کی سرحد پر آ رہوتی ہے۔ وجود کے منتہا پر آغازِ تخلیق ہے اور تخلیق کے جوہر میں بنیادی عناصر ہیں۔ علامہ طالبؔ جوہری نے اس مرثیہ میں عناصر کی شاعری کی ہے۔ ان کا پیرایۂ اظہار مصورانہ ہے جس میں خطوط بہت واضح اور روشن ہیں۔ پہلے عنصر کے تحت انہوں نے سماوی ماحول کی تعبیر کی ہے۔ ان کے مزاج شعری کا فطرت سے نقطۂ اتصال مکاں کے بجائے زماں میں ہے۔ اس لئے زمین کی مصوری کا زاویہ تناظر زمین سے بالا ہے۔ سماکی مذہبی علویت کے ساتھ جدید ذہن کے خلائی تحیر کی لطافت بھی اس میں شامل ہے چہرے سے کچھ مثالیں دیکھیے، مطلع ہے ع

جب کُن ادا کیا لبِ حکمت خطاب نے

اس ایک لفظ کُن سے عدم کی وسعت اُجاگر ہوگئی اور اس چوکھٹے میں نقوش بالتزام سجتے گئے ہیں۔

چھنگی فضا کی سطح پہ سورج کی روشنی ڈوبی خلا کی تہہ میں ستاروں کی روشنی
لرزی جبال و دشت و بیاباں پہ چاندنی اُمڈی مہیب غار پہ راتوں کی تیرگی

یہ سلسلہ بڑھا تو منازل بدل گئے
دن رات ماہ و سال کے سانچے میں ڈھل گئے

..............................

اُجڑی ہوئی زمیں پہ ہیں بے کیف برگ و بار ہے ساری کائنات کو اک کرب انتظار
ناگاہ آسماں سے اُڑی گرد کردگار ٹوٹا حریم ہستیٔ مطلق سے اک شرار
اُترا تو رنگ محفلِ ہستی پہ چھا گیا
انسان کائنات کا دل بن کے آ گیا

یہاں کلیدی مصرے دو ہیں۔

ع ڈوبی خلا کی تہہ میں ستاروں کی روشنی

ع ٹوٹا حریم ہستیٔ مطلق سے اک شرار

پہلے مصرعے سے ایک خنکی اجاگر ہوتی ہے جس کو تقدیس کے احساس کے لئے زینہ بنایا گیا ہے اور جو دوسرے نقش شدہ مصرعے کی کیفیت میں آ کر ٹھتا ہے درمیان میں وہ رنگ ہے جو جس کی تلاش غالبؔ نے خونِ جگر ہونے تک کی ہے، ایسی سیاہی جو محیط بھی ہے اور روشن بھی۔ ان مناظر کے دوران دوسرے عنصر کی مصوری ہے۔

گرمی بڑھی تو آگ لگی کائنات میں کرنوں کے تیر چلنے لگے شش جہات میں
اجسام کو اماں ہے دن میں نہ رات میں چھالے پڑے ہیں دھوپ سے پائے حیات میں
شعلے برس رہے ہیں فضائے اثیر سے
اک لَو نکل رہی ہے دلِ زمہریر سے

دوسرے مصرعے کی تشبیہ مرثیہ کے روایتی اسلوب میں ہوتے ہوئے بھی یہاں میل نہیں کھا رہی ہیں باقی مصرعے اعلیٰ ہیں اور چوتھا مصرعہ تو بہت بولتا ہوا ہے ع

چھالے پڑے ہیں دھوپ سے پائے حیات میں

اس مصرعے کی خوبی یہ ہے کہ داخلی نزاکت سے خارجی مطلقیت اجاگر کی گئی ہے۔ ایسے مصرعے ان کے یہاں بھی کم ہیں، چونکہ وہ عموماً ایک کیفیت کی اساس کو گرفت میں کر کے ایک لفظ میں سمو کر اس میں غیر منقسم توجہ مرکوز کر دیتے ہیں۔ تشریحی حصے کے اس مرثیہ کو دیکھئے جو تاثر میں مندرجہ بالا مصرعے سے قریب ہے ع

وہ حادثہ جو اک ابدی چیخ بن گیا

علامہ طالبؔ جوہری کے اسلوب سے ابتدائی شناسائی میں بھی ان پر جوش ملیح آبادی کے ایک گونہ اثر کا احساس ہوتا ہے، صوتی التزام کا تو نہیں مصوری کا۔ جوشؔ نے ''قلم''، ''موجد و مفکر'' اور ''حیات وموت'' تینوں مراثی میں وسیع موضوعات کو تصویری ترتیب سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ سماوی ماحول کے ذکر میں کہا جا چکا ہے۔ طالبؔ جوہری واضح اور جلی خطوط استعمال کرتے ہیں مگر ماحول کی تعبیر میں جو اثر آفرینی ہے وہ اس تکنیک کے باوصف انہیں اقبال کے قریب لے گئی ہے۔ اس تصویری تمہید کے باعث بحث کا آغاز ہے۔ بحث شکر کی اخلاقی اور منطقی اہمیت سے شروع ہوتی ہے لیکن ع

لیکن ادائے شکر کی ہے ایک شرط بھی
یعنی علوئے رتبۂ منعم سے آگہی

اس کے بعد حادث وقدیم کی بحث چلتی ہے جو علت العلل کے موضوع تک آجاتی ہے۔

علامہ طالبؔ جوہری کی تشریح کے مذہبی مآخذ تین ہیں۔ تمہید کے بند کے بالا سورۂ اعلیٰ کی تیسری آیت ہے: وَالَّذِی قَدَّرَ فَھَدٰی ہ۔ نہج البلاغہ کا خطبۂ اوّل اور امیر المومنینؑ کا قول: مَن عرف نفسَهٗ فقد عرف رَبَّهٗ. جگہ جگہ سے مثالیں دیکھیں۔

دنیا میں گاہ صبح ہے اور گاہ شام ہے — جس میں تغیرات ہوں وہ لا دوام ہے
تغیر اور حدوث میں اک التزام ہے — حرکت اسی تغیر پیہم کا نام ہے
تغیر ماہیت حرکت کی دلیل ہے
پیمائش جہاں کے لئے سنگ میل ہے

تعریف وقت یہ ہے کہ لمحات ہوں بہم — ماضی عدم زمانۂ آئندہ بھی عدم
دونوں کے درمیان جو نفس لے رہے ہیں ہم — اس لمحے کا وجود دقیقے سے بھی ہے کم
اک تانئے کے طول میں یہ جسم و جان ہے
انسان کا وجود فقط ایک آن ہے

بالکل اسی طرح سے ہے یہ ساری کائنات — اس کو عطا ہوئی ہے بس اک آن کی حیات
یعنی فروغ شعلۂ خس کی طرح ثبات — جگنو کی روشنی پہ مسلط سیاہ رات

ہر چیز استعارۂ امید و بیم ہے
اس پر یہ ادّعا ہے کہ عالم قدیم ہے

ملاحدہ کے روبرو موحدین کی روایتی دلیل علت العلل کی دلیل رہی ہے۔ بیسویں صدی میں برٹرینڈ رسل نے اس دلیل کو توڑنے کی ازحد سعی کی ہے رسل کا کہنا ہے کہ اگر علت العلل لازم ہے تو یہ کہاں سے لازم ہے علت العلل خدا ہے۔ جس منطق سے اللہ کو علت کہا جارہا ہے۔ اسی منطق سے مادہ کو بھی علت العلل کہا جا سکتا ہے۔ اس کا جواب طالبؔ جوہری نے وجود کی ماہیت سے دیا ہے۔ کائنات کی بے قراری کے مقابلے میں ثبات کے تصور کو انہوں نے بہتر اور عقلی انتخاب ثابت کیا ہے۔ مادہ اپنی ماہیت سے متحرک تو ثابت ہوتا ہے۔ محرک ثابت نہیں ہوتا۔ محرک کو متحرک کے مزاج سے ماورا ہونا چاہیے صرف اوّل نہیں۔

اسی سلسلے میں عرفان ذات سے عرفان حق کا سفر دکھایا گیا ہے۔

ہر شے کی ابتداء ہے بفحوائے کاف و نون ہر چیز پر محیط ہے اعداد کا فسون
باوصف احتیاج سوئے حرکت و سکون انکار ایک جہل ہے، تشکیک اک جنون
وقت و مکان و شکل و جہت کا اسیر ہے
منکر ہی خود وجودِ خدا کا سفیر ہے

جملہ معترضہ کے طور پر یہ مصرعہ دوبارہ دیکھئے:

ہر چیز پر محیط ہے اعداد کا فسوں

کتنے کلاسیکی انداز میں کتنے جدید احساس کو سمیٹ لیا ہے۔ ایسے مصرعے اور ایسا شعور ہی مستقبل میں مرثیہ کی اسلوبی افادیت کی ضامن ہیں۔ اگلے بند کی بیت دیکھئے جس میں امیرالمومنینؑ کے مذکورہ بالا قول کی تشریح ہے۔

عرفانِ نفس بیخ کنِ گمرہی بنے
خود آگہی ابھر کے خدا آگہی بنے

اس مرثیہ میں گریز دو مرحلوں میں ہے۔ پہلا مرثیہ مقصدِ شہادت کا بیان ہے۔ اس کے بعد دو ضمنی

موضوعات آتے ہیں۔ ایک مرثیہ گوئی پر نظری تنقید اور دوسرا خیر وشر کا مسئلہ۔ پھر مناظر شہادت گریز کا دوسرا مرحلہ بنے ہیں۔

توحید سے سبق شرف کائنات کا  فرض عظیم عارف ذات و صفات کا
نذر وجوب فدیہ ہے کل ممکنات کا  مقصد جو ہے حسینؑ کے ذوقِ حیات کا
یعنی رُخِ حیات پہ تابندگی رہے
سر جسم سے جُدا ہو مگر زندگی رہے

یہ مرثیہ کا وہ مقام ہے جہاں سے طالبؔ جوہری کے انفرادی مضامین جدید مرثیہ کے نمائندہ مضامین میں ڈھل جاتے ہیں۔ مقصدِ شہادت کا بیان مرثیہ کی روحِ عصر ہے۔ اس مقصد کو طالبؔ جوہری نے ایک طرف توحید اور کلام کے مضامین سے منسلک کر کے بیانِ شہادت کو وسیع تر تناظر دے کر مرثیہ کی آفاقی حیثیت کو منوایا ہے۔ جبھی "ذوقِ حیات" جیسی عام ترکیب اتنی معنوی وسعت کی حامل ہو گئی ہے جو اس تمہید کے بغیر ممکن تھی نہ کسی اور صنفِ سخن میں۔

تاریخِ کائنات کے ہر زیر و بم کے ساتھ  لرزاں و خونچکاں ہیں ہزاروں ہیں حادثات
لیکن وہ حادثہ جو ہوا تھا لبِ فرات  اپنی جلو میں لے کے چلا سرمدی حیات
وہ حادثہ جو اک ابدی چیخ بن گیا
یعنی صریرِ خامۂ تاریخ بن گیا

پانچواں مصرعہ زیرِ بحث آچکا ہے۔ اس کا اعادہ ضروری ہے چونکہ طالبؔ جوہری اس تشریحی حصے میں بھی ہر واقعہ اور جذبہ کے تشخص کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں، اور جزئیات میں بھی عنصری رجحان کو لے آئے ہیں۔ اگلے بند میں واقعۂ کربلا کی بنیادی جذباتی افادیت اجاگر کی گئی ہے۔

منہاجِ حق و صدق کے سالک تھے جو حسینؑ  اک عزمِ لازوال سے بڑھتے رہے حسینؑ
کس ولولے سے راہِ رضا پر چلے حسینؑ  ہر حدِّ امتحاں سے آگے گئے حسینؑ
خود سارے کربِ جمیل کے صبر و قرار سے
انساں کو دی نجات غمِ روزگار سے

اس بند میں بنیادی جذبہ کا ہونا اس سے بھی ثابت ہے کہ اس نقطے پر ایک موحد اور ایک ملحد شاعر کا اتفاق ہوا ہے۔ مرزا یگانہ نے کہا تھا۔

دل بھی اپنی جگہ خدا اپنا
ہم غریبوں کا آسرا کیا ہے
ڈوب کر پار اُتر گیا اسلام
آپ کیا جانیں کربلا کیا ہے

جہاں تک اس مرثیہ کے تنقیدی حصے کا تعلق ہے، ایک بیت سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ طالب جوہری مرثیہ اور مسدس میں تفریق کرتے ہیں مگر اس کی خاطر خواہ وضاحت انہوں نے کی نہیں۔

دنیائے شعریت ہے مسدس میں کیا نہیں    وہ اصطلاح فن میں مگر مرثیہ نہیں

اُن کا سب سے شدید اصرار ہے ع: میدانِ مرثیہ متقاضی ہے مرد سے۔

جدید وقدیم مرثیہ کی بحث میں بحیثیت ذاکر ان کا موقف یہ ہے۔

گو زیرِ بحث آئیں علوم معاشرت    لیکن اصولِ دیں سے ہو ان کی مفاہمت
اسلوب پیشکش میں رہے طرز مرثیت    چھائی رہے مزاج سخن پر حسینیت
دین و ادب کے بیچ کی سرحد ہے دوستو
یہ درس گاہ فکرِ محمدؐ ہے دوستو

بیت کی برجستگی پر توجہ رہے۔ ضمنی موضوعات میں جس خوش اسلوبی اور دل کشی کے متقاضی ہیں وہ یہاں موجود ہے۔ اس کے بعد خیر وشر کا مسئلہ زیرِ بحث آیا ہے۔ یہ بحث اردو شاعری کے روایتی موضوعات میں شامل ہے۔ تصوف کے زیرِ اثر شعراء کا رجحان جبر کی جانب رہا ہے۔ بقول میرؔ۔ ع: چاہے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام۔ اور کہیں یہ مسئلہ سنجیدگی سے زیرِ بحث آیا تو بقول جمیلؔ مظہری مرحوم:

ذہنوں نے یہیں پہ کھائے جھٹکے    آ کر عرفاء یہیں پہ بھٹکے

آئمہ کے اقوال کی ترجمانی اردو شعر میں کم ملے گی۔ یہاں شاعر کے دینی علوم کا اکتساب سامنے آیا ہے۔

سمجھو کہ عدل محض ہے جابر خدا نہیں     مجبور ساز مومن و کافر خدا نہیں
ہمت فزائے فاسق و فاجر خدا نہیں     مجبور کو سزا ہو قاہر خدا نہیں
سوچو اگر طہارت عقل و شعور ہے
یہ اعتقاد عقل سے خود کتنا دور ہے

یہ بند سارے مرثیہ کا سب سے عمیق بند ہے۔ ظاہر ہے یہ تعلیم معصومینؑ ہے۔ یہ علامہ طالب جوہری کی ذاتی فکر نہیں ہے۔ مگر یہ بند اس ثبوت کے لئے کافی ہے کہ شاعری خود ایک منطق ہے۔ مسائل کی نزاکت کو دل میں اتارنا ایک شعری کارنامہ ہی نہیں عقلی کارنامہ بھی ہے۔ ''عدل محض'' کی ترکیب سے بحث کو کس قدر محکم بنا دیا گیا ہے اس کو وہ لوگ بہتر سمجھ سکتے ہیں جن کے پیش نظر اشاعرہ اور معتزلہ کے طویل مناظرے رہے ہیں۔ یہاں عدل و قدرت کے درمیان طالبؔ جوہری نے رحمت خداوندی کو ثالث بنایا ہے۔ اور یہ وہ صفت الٰہی ہے جس کا تعلق براہ راست دل سے ہے۔ فنی اعتبار سے دیکھیں تو قوافی اپنے عقلی التزام کے علاوہ اپنی نشست کے لحاظ سے بھی قابل توجہ ہیں کہ علیحدہ صورت میں ثقیل ہونے کے باوجود برجستہ محسوس ہوتے ہیں۔

مسدس اور مرثیہ میں تفریق کرنے کے باوجود ان کے مرثیہ میں بین اور مصائب کے حصے میں مقصدی پہلو سے مربوط ہیں۔

یثرب سے نکلے اور حرم کبریا میں آئے     کعبے کو الوداع کہا اور کربلا میں آئے
دین خدا کو لے کے حصار بقا میں آئے     مثل رسولؐ رہگذر ارتقاء میں آئے
پایا جو طور مرضئ داور حسینؑ نے
عاشور کو لٹا دیا سب گھر حسینؑ نے

تنہا کھڑے ہیں دشت پُر آشوب میں امام     فرماتے ہیں کہاں گئے اصحاب نیک نام
عباسؑ ہم سے ہاشمیوں کے مہ تمام     ہم دشت میں ہیں تم نے کیا خلد میں قیام
گھبراتے ہو گے خلف لطافت نہاد میں
پانی پیا نہ ہو گا سکینہؑ کی یاد میں

سوئے ہوئے ہو دیر سے اکبر بس اب اٹھو کیا کہہ رہا ہے یہ پدر سُن تو لو
سُن لوں صدا تمہاری تو دل کو سکون ہو ہنگامِ عصر آ گیا اُٹھ کر اذان دو
اب تک ہے یاد وقتِ سحر کی اذان کی
اک بار پھر سنا دو صدا نانا جانؐ کی

مصائب کے یہ بند بین کی نوعیت اور بین کی شدّت کو عیاں کرنے کے لئے کافی ہے۔

طالبؔ جوہری کا یہ مرثیہ کئی لحاظ سے منفرد ہے اور قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ ان کی پہلی کوشش کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہے۔ نوشتی کی جھلک ع

دیکھو حسینؑ ٹوک رہے ہیں یزید کو

جیسے دو ایک مصرعوں تک محدود ہے۔ افسوس کہ ان کے دوسرے مراثی فی الحال دستیاب نہیں۔ اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کے قدم ترقی کی جانب اٹھے ہیں کہ نہیں۔ ان دنوں وہ قصیدہ نگاری کی طرف مائل ہیں۔ یہ ان کا خاندانی حق ہے چونکہ تجدید، قصیدہ نگاری میں ان کے والد مولانا ماجد مولانا مصطفےٰ جوہرؔ صاحب مدظلہٗ العالی کی ہستی نمایاں رہی ہے لیکن میری ناچیز رائے میں علامہ طالبؔ جوہری کے قصائد اعلیٰ ہوتے ہوئے بھی ان امکانات کے حامل نہیں ہیں جو انہوں نے اپنے پہلے مرثیے میں پورے کئے ہیں۔ اور جو ان سے توجہ کا حق طلب کر رہی ہے۔ ان کے مرثیہ کا موضوع بڑا دقیق تھا۔ شکر ہے کہ کلام جوشؔ سے ان کی رغبت نے ان کو دبستانِ دبیرؔ کے انغلاق سے محفوظ رکھا اور ایک سنجیدہ مگر دل آویز پیرایۂ اظہار دیا ہے۔

از

ڈاکٹر محمد رضا کاظمی

۱۶/۱۱/۷۸

# رثائی ادبیات میں علامہ طالب جوہری کی وسیع النظری، چند ادبی پہلو

ڈاکٹر ہلال نقوی

اس بات کو ۳۵ برس گزر گئے جب ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ'' کے عنوان سے میں نے کراچی یونیورسٹی سے اپنی ڈاکٹریٹ کا مقالہ مکمل کیا۔ اس مقالے میں کراچی کے جن مرثیہ نویسوں پر تنقیدی اور تحقیقی زاویوں سے میں نے کچھ لکھا تھا ان میں علامہ طالب جوہری کا نام بھی شامل ہے۔ ۱۹۶۸ میں لکھے جانے ان کے پہلے مرثیے پر داد و تحسین کی بھی باتیں تھیں اور...... کے کچھ تنقیدی لمحات بھی میں نے لکھ دیئے تھے۔ ایک ہزار صفحات پر مشتمل یہ مطبوعہ مقالہ علامہ کی نظر سے کئی بار گزرا بھی ہے بلکہ یہ ان کے کتب خانے میں بھی موجود ہے۔ لیکن انہوں نے اپنے مرثیے پر میری تنقیدی رائے کو کھلے دل سے قبول کیا، میرے کام کی تعریف کی اور میری محنت کو سراہا بھی۔ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی ہے۔

نوّے بندوں پر مشتمل ان کا ایک مکمل مرثیہ سب سے پہلے ادبی و رثائی جریدے ''رثائی ادب'' (۱۹۹۸) میں شائع ہوا یہی مرثیہ دوسری بار'' جدید بیاضِ مرثیہ'' (۲۰۱۲) کا حصہ بنا۔ کراچی میں کالجز کی سطح پر اردو کا جو نصاب ترتیب دیا گیا ہے اس میں صنفِ مرثیہ سے ''گریز اور پرہیز'' کا جو متعصبانہ رویہ اپنایا گیا اُس کا تذکرہ میں نے اپنی اسی کتاب کے دیباچے میں کیا۔ علامہ صاحب نے اسی زمانے میں ایک ادبی بیٹھک میں اس پر پُر زور بحث کی، مرثیے کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے انہوں نے اردو کی ترقی میں اس کے کردار پر روشنی ڈالی۔

اس چھوٹے سے مضمون میں اُن کی مرثیہ نگاری پر میں زیادہ گفتگو نہیں کر رہا۔ اس کے لئے فکری اور تہذیبی مباحث کے دائرے میں کئی موضوعات چھیڑنے پڑیں گے۔ میں ذہنی طور پر اس وقت اس کے لئے آمادہ نہیں ہوں۔ البتہ یہ ضرور چاہتا ہوں کہ رثائی شاعری کے بارے میں ایک صاحبِ منبر خطیب

کے اُن افکار کو ضرور سامنے لاؤں جس سے ان کی وسیع النظری اور کشادہ خیالی کی کچھ تصویریں سامنے آ جائیں۔

پیشِ نظر کتاب کے مرتب فرحان رضا ہیں جو پاکستان کے جواں سال تحت اللفظ خوانوں میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے ''رثائیاتِ علامہ طالب جوہری'' میں یقیناً ان کے وہ تمام مضامین لئے ہوں گے جو وہ رثائیات کے حوالے سے لکھتے رہے ہیں۔ ان میں ایک مضمون جس میں شاہد نقوی مرحوم کی مرثیہ نگاری پر لکھتے ہوئے انہوں نے اپنے نظریہ رثا کا بھی اظہار کیا ہے۔ میرے نقطۂ نظر سے صنفِ مرثیہ کے حوالے سے یہ ایک بہت اہم ادبی دستاویز ہے۔ رثائی ادب کے ۲۵ ویں شمارے (۲۰۰۲) میں اس کا ایک...... اقتباس میں نے شائع کیا تھا اور اس کی سرخی انہی کے الفاظ سے مستعار لے کے یہ قرار دی تھی۔

''افسوس کہ مرثیے کو مذہبی موضوعات کی تنگنائے بنا دیا گیا''۔

اس ذیل میں جب ان کی کچھ آراء میرے رسالے میں شائع ہوئیں تو کئی ممتاز ادیبوں نے خطوط بھی لکھے اور علامہ کے افکار کو بہت سراہا۔ باوجود اس کے کہ وہ منبر کی شخصیت ہیں۔ خطیب ہیں، ذاکر ہیں، عالم دین ہیں، یعنی مولوی اور مولانا دونوں ہیں لیکن مرثیے کو محض مذہبی موضوعات کی تنگنائے بنا دیئے پر ان کی تنقید اُن کے ترقی پسند ذہن کی عکاس ہے۔ دراصل اُن کی شخصیت میں جو ایک تخلیقی شاعر اور نقاد پوشیدہ ہے وہ ان کی منبر والی شخصیت پر حاوی آ جاتا ہے۔ انہوں نے بیانگ دہل یہ بات لکھی کہ مرثیہ جو ہیئت اور موضوع کا مواج شعری سمندر تھا اسے مخصوص مذہبی موضوعات کی تنگنائے میں تبدیل کر دیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس صنف کی شعری حیثیت محدود ہوتی چلی گئی۔ کراچی جو جدید مرثیہ ... ایک بہت بڑا مرکز ہے اور جہاں جوش ملیح آبادی، نسیم امروہوی، سید آلِ رضا اور جدید طرز احساس ... متعدد شعراء موجود ہے وہاں اس فکر کو نمایاں کرنا ایک تحریک کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ زور دے ... کہتے ہیں کہ عہد قدیم کے مرثیہ نگاروں نے ہر ممکن کوشش کی کہ مرثیہ ادبی صنف ہی رہے ... خالص مذہبی نظم بن کر نہ رہ جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علامہ طالب جوہری کے یہ الفاظ جدید مر... تفہیم اور تشہیر میں ایک تنقیدی منشور کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تحریر کے آغاز میں علامہ طالب جوہری صاحب قبلہ کی اعلیٰ ظرفی کا ذکر ہوا تھا جس پر مجھے یاد آیا۔ ۲۰۱۰ء میں میری کتاب ''جوش کے انقلابی مرثیے'' منظر عام پر آئی۔ جس میں اُن کا جملہ رثائی اور عرفانی کلام بھی شامل تھا۔ اس اعتبار سے جوش صاحب کی معروف و مشہور نظم ''ذاکر سے خطاب'' (۱۹۳۱) بھی اس کا حصہ تھی۔ انہوں نے فرمائش کر کے مجھ سے یہ کتاب منگوائی۔ وہ جوش صاحب کے بہت قدر دان ہیں۔ یہ ان ہی کے الفاظ ہیں جو وہ کئی احباب کے سامنے بھی کہہ چکے ہیں کہ جوش ملیح آبادی اردو کے سب سے بڑے اور اہم ترین شاعر ہیں۔ یہ اعتراف یقیناً اپنی جگہ پر لیکن کسی ذاکر کے لئے جوش کی نظم ذاکر سے خطاب، ہضم کر لینا آسان نہیں ہے اور پھر وہ تو اس دور کے سب سے نامور ذاکر ہیں۔ اس نظم کے ساتھ میں نے کچھ فٹ نوٹ بھی لکھے تھے جن میں کچھ تلخی بھی تھی۔ لیکن ان کے ماتھے پر کوئی شکن نہیں آئی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کسی اور سے اس شعلہ پرور نظم کے بارے میں کچھ کہا ہو لیکن کم از کم مجھ سے جوش صاحب کے حوالے سے کوئی ترش بات نہیں کہی بلکہ اس نظم کے جواب میں اس نظم کے تذکرہ ضرور کیا جو ان کے والد مرحوم قبلہ مصطفےٰ جوہر صاحب نے لکھی تھی۔ ''گنبد کی صدا'' نامی یہ نظم خود علامہ نے مجھے دی جس کا ذکر میں اپنے مقالے میں کر چکا ہوں۔ وہ اکثر یہ بات کہا کرتے ہیں کہ جوش صاحب جس قامت کے دانشور ہیں اور ان کی جو بلنداری سطح ہے تو ان کے لہجے کی کاٹ کو تو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔

☆☆☆☆☆

maablib.org

# حضرت علامہ طالب جوہری کے مرثیے
## (خواندگی کے حوالے سے)

ایک بار کسی نشست میں ایک صاحب نے فرمایا کہ ہم نے غالب کی زمین میں غزل کہی ہے۔ اس جملے پر وہاں موجود ایک ثقہ و عالم بزرگ نے فرمایا "اللہ اللہ غالب کی زمین میں غزل کہنا ایسا ہی ہے جیسے بڑے زمیندار یا وڈیرے کی زمین پر بلا اجازت کاشت شروع کر دی جائے...... انتہائی خطرناک کام۔ کچھ ایسا ہی خطرناک کام مجھے بھی سونپا گیا ہے۔ عزیزی فرحان رضا سلمہٗ نے کہا کہ علامہ طالب جوہری کے رثائی کلام کا مجموعہ زیرِ اشاعت ہے اور یہ حقیر فقیر چونکہ ان کے دونوں مراثی مجلس میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر چکا ہے چنانچہ ان مراثی کے صوتی آہنگ اور تحت اللفظ خواندگی کے حوالے سے کچھ تحریر کر دیں۔ اپنے بیارے کی دل شکنی ہرگز مقصود نہیں چنانچہ "ہمائے اوجِ سعادت بدام ما افتاد" کا نعرہ لگاتے ہوئے شروع کرتا ہوں۔ اولاً ہمیں اس بات کا اعتراف بہ صد فخر کرنا چاہیئے کہ ماضی بعید و قریب میں جتنے مستند شعراء گزرے ہیں، عالم و فاضل ہونے کے باوجود خطیب نہیں تھے۔ اسی طرح ماضی بعید و قریب کے علماء و خطباء اعلیٰ و ارفع ادبی ذوق رکھنے کے باوجود اور رثائی کلام کہنے کے باوجود کسی نے بھی مکمل مرثیے نہیں کہے۔

حضرت علامہ طالب جوہری کو یہ شرف حاصل ہے کہ عالم متبحر و خطیب بے مثل ہونے کے ساتھ سلام و دیگر رثائی و غیر رثائی کلام کے علاوہ دو مکمل مرثیے کہے جو روایت سے ہٹ کر ایک بات ہے۔

اس کے باوجود طالب جوہری صاحب اس کو اپنا شوق ہی کہہ رہے ہیں۔

یہ شوق ہے میرا، مری پہچان نہیں ہے

حضرت طالب جوہری صاحب کے دو مراثی "وجودِ باری تعالیٰ" اور "ہدایت" اس مجموعے میں شامل ہیں۔ گو نفسِ مضمون پر گفتگو میری بساط سے باہر ہے صرف اتنا کہوں گا کہ "وجودِ باری تعالیٰ" اس معبودِ حقیقی کے وجود پر جس طرح عقلی و منطقی ثبوت فراہم کرتا ہے اور "ہدایت" جس استدلال کے ساتھ امامِ زمانہ

کے وجود پر گفتگو کرتا ہے تو پھر اس کے بعد کوئی کور باطن، ناعاقبت اندیش ہی ان حقیقتوں کا منکر ہو سکتا ہے۔

نجانے کیوں "وجودِ باری تعالیٰ" کے تشبیب کے بند اور "ہدایت" کے آٹھویں بند اور بعد کے چند بند پڑھتے ہوئے مجھے ہمیشہ جوش صاحب کی "طلوعِ فکر" یاد آتی ہے، دیکھئے نا!

حضرت جوش کا مطلع شروع ہوتا ہے ؏ جب چہرۂ اُفق سے اٹھی سرمئی نقاب

حضرت طالب جوہری کا مطلع شروع ہوتا ہے ؏ جب کن ادا کیا لبِ حکمت خطاب نے

فرق صاف ظاہر ہے جوش صاحب سر بہ سر شاعر ہیں، ان کا شاعرانہ مزاج و ذوق نقاب، پسِ نقاب، بلکہ چشمِ سُرمہ سا کا دلدادہ۔

حضرت جوہری عالم ہیں، خطیب ہیں، حکیم ہیں اور مستزاد کہ شاعر بھی چنانچہ "کن"، "حکمت" اور "خطاب" "مصرع کا جز ہیں۔

اگر صوتی آہنگ اور تحت اللفظ خواندگی کے حوالے سے گفتگو کی جائے تو جناب طالب جوہری کے دونوں مرثیے نغمگی سے بھرپور ہیں، صوتی آہنگ جو صوتی علوم کا ایک جز ہے خود ایک علیحدہ مضمون کا متقاضی ہے جس میں قرأت قرآنی، حمد و نعت کی خوش الحان خواندگی، قوالی، چہار بیت، ذاکری، سوزخوانی، خطابت اور تحت اللفظ مرثیہ خوانی بھی شامل ہیں۔ ہم یہاں صرف ان دو مراثی کی تحت اللفظ خواندگی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں بالخصوص ان مرثیوں کی بحر، الفاظ کا در و بست (بندش) اور الفاظ کا انتخاب۔

آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ "ہدایت" میں بحرِ ہزج (مثمن، اخرب، مکفوف، محذوف) استعمال ہوئی ہے جو ایک رواں بحر ہے، ہزج کے معنی ہی نغمگی کے ہیں۔ اسی طرح "وجودِ باری تعالیٰ" بحرِ مضارع (مثمن، اخرب، محذوف) میں لکھا گیا مرثیہ ہے، بحرِ مضارع کو مضارع غالباً اسی لئے کہتے ہیں کہ بحرِ ہزج سے "مضارعت" (مشابہت) رکھتی ہے اس لئے کہ دونوں کا پہلا رکن "مفعول" ہے۔ دونوں رواں بحریں ہیں۔

تحت اللفظ خوانی کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ رواں بحر میں کہے گئے مرثیے عموماً پڑھنے میں بھی رواں ہوتے ہیں، ایک نغمگی کا احساس لئے ہوئے گرتی ہوئی آبشار، چنانچہ

"جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے" انیسؔ

اور "جب کن ادا کیا لبِ حکمت خطاب نے" طالب جوہریؔ

کی روانی وسلاست سے کون انکار کرسکتا ہے۔

دوئم یہ کہ اگر بندش چست ہو، مصرعوں میں تعقید نہ ہو تو تحت اللفظ خوانوں کو معنی کے ابلاغ میں آسانی ہوتی ہے، مرثیہ پڑھنا نہیں پڑھتا بلکہ مرثیہ خود اپنے آپ کو پڑھواتا ہے۔ اس کے برعکس سُست، تعقید شدہ اور مغلق بندش میں معنی کا پہنچانا دشوار ہوجاتا ہے۔ تاوقتیکہ کے تحت اللفظ خواں احتیاط سے کام نہ لے۔

آپ "وجودِ باری تعالیٰ" مطلع سے مقطع تک پڑھ جائیں ایک خاص روانی محسوس ہوگی، سہلِ ممتنع مگر بھرپور معنویت کے ساتھ، ایسا نہیں کہ صرف بلاغت ہے بلکہ شاعرانہ حسن بھی، ذرا اس مصرعے کی شعریت اور جمالیات پر نظر کریں۔

چھالے پڑے ہیں دھوپ سے پائے حیات میں

حضرت علامہ طالب جوہری عالم دین بھی ہیں اور مبلغ بھی اس لئے موعظت بھی ساتھ ساتھ ہے مگر کس سہل پسندی سے، شکرِ خداوندی کی تلقین کس عمدہ طور پر کی گئی ہے۔

گر کیجئے سماج کی رسموں کا تجزیہ جز ہے معاشرے کا یہ ادنیٰ سا قاعدہ

منعم کی اک ادا پہ بھی لازم ہے شکریہ یہ رشتہ نفس جو ہوا ہے ہمیں عطا

صرف اس کی سمت چشمِ تعقل جو وا کریں

لازم ہے پھر کہ شکرِ مسلسل ادا کریں

یا

اسی مرثیے "وجودِ باری تعالیٰ" میں بند ۶۹ میں سورہ الحمد کا کیا سلیس منظوم ترجمہ ہے

معبود سے ہے عبد کا اب اس طرح خطاب ہم تیری بندگی و اعانت سے بہرہ یاب

خواہاں ہیں ہم سے چھوٹے نہ ہرگز رہِ ثواب رہ ان کی جن پہ ہے تیرا انعام بے حساب

جو تیرے عبد، راہنما تیرے دین کے

مغضوب کے جو غیر ہیں اور ضالین کے

یہ بند ملاحظہ ہو

اس نظم ہست و بود پہ ایمان چاہیئے ۔۔۔ ہنگامہ وجود کا ایقان چاہیئے
احساس اپنی ذات کا ہر آن چاہیئے ۔۔۔ یعنی خود اپنے نفس کا عرفان چاہیئے
عرفانِ نفس بیخ کنِ گمرہی بنے
خود آگہی ابھر کے خدا آگہی بنے

"ومَن عرفہ نفسہ فقد عرفہ ربّہ" کی تشریح نظم میں وہ بھی سہل ممتنع میں صرف ایک عالم ہی کر سکتا ہے، مندرجہ بالا بند کو پڑھنے میں نہ کوئی قباحت محسوس ہوتی ہے نہ غلط جگہ پر سانس ٹوٹنے سے معنی میں کوئی خلل پڑتا ہے ورنہ اساتذہ کے اکثر مصرعے نامناسب جگہ پر وقوف آجانے سے کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں۔ بے شمار مثالیں ہیں، ایک یہ مصرع

ٹوٹے تھے سب، رسولؐ کے پیارے حسینؑ پر

اس مصرع کا ادا کرنا کیا احتیاط مانگتا ہے۔

اس مرثیے میں کربلا کے حوالے سے کیا بیت لکھی ہے، پوری کربلا سما گئی ہے ع

وہ حادثہ جو اک ابدی چیخ بن گیا
یعنی صریرِ خامۂ تاریخ بن گیا

اس بیت کو تحت اللفظ خواں اگر سمجھ کر اور پوری طرح محسوس کر کے ادا کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ مجلس داد و تحسین سے نہ گونجے۔

وجود باری تعالیٰ میں مسدس خاص کر مرثیے کی تعریف کرتے ہوئے علامہ صاحب نے وہی فرمایا جو انیس نے کہا بلکہ عملاً اُس پر عمل بھی کیا۔

لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووے ۔۔۔ مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

مگر ساتھ ہی ساتھ مجالس کو درس گاہ محمدؐ اور مرثیہ کو اُس کا نصاب بھی کہا بشرطیکہ وہ اصولِ دین سے مفاہمت رکھتے ہوں...... بیشک...... بالکل بجا اور یہ جملہ ایک عالم ہی کہہ سکتا ہے۔

میری کیا مجال کہ میں علامہ طالب جوہری صاحب کی کسی رائے سے انحراف کی جرأت کروں۔ مگر جناب عالی

"گوپاک ہو حسام وسمند وغیرہ سے" کہہ کر آپ نے میمنہ، میسرہ، قلب لشکر، نیم رخ، جنیو، بگٹٹ، سرپٹ، پوئی، مرثیے سے نکال دیے، پوری رزم غائب، پھر تو یہ ایک تبلیغی وفکری نظم ہو جائے گی۔ رزمیہ عنصر کو بھی شامل مرثیہ رہنے دیں۔ ورنہ

رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی   بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

کا کیا ہوگا؟

جبر واختیار کی بحث ایک دقیق بحث ہے، ناسخ نے اپنے اس شعر میں اس بحث کو یوں بھگتانے کی کوشش کی ہے۔

چلا عدم سے میں جبراً تو بول اٹھی تقدیر
بلا میں پڑنے کو کچھ اختیار لیتا جا

مگر علامہ صاحب نے صرف ۵ بندوں میں اس مشکل بحث کو تمام کیا ہے اور آسان الفاظ میں۔ ماہر علم الکلام، منطق، فلسفہ دانی اور شاعرانہ چابکدستی کی اعلیٰ ترین مثال "وجود باری تعالیٰ" کے ۴۱ سے ۴۵ ملاحظہ فرمائیں۔

وجود باری تعالیٰ کے بیشتر مصرعے اور بیت لاثانی ہیں۔ مثلاً

دشمن خدا کو لے کے حصار بقا میں آئے

یا یہ بیت

پہرہ لگا دو روک لو رستہ فرات کا
خشکی میں جا رہا ہے سفینہ نجات کا

اس مرثیے کے مصائب کے بند بھی پڑھنے میں اور مجلس میں پیش کرنے میں کسی خاص محنت یا مشاقی کے متقاضی نہیں۔ کیا اچھی، منگی اور پُر اثر بیت ہے، نئے رخ سے جب امام حسینؑ حضرت عباسؑ کے لاشے سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

گھبراتے ہو گے خلد لطافت نہاد میں
پانی پیا نہ ہو گا سکینہؑ کی یاد میں

اللہ اللہ بی بی سکینہؑ اور ان کی پیاس کی یاد کس طرح خلد کی لطافت پر بھاری ہے۔

مصائب کے یہ بند پڑھتے ہوئے میر انیسؔ کے مرثیے "جب خاتمہ بخیر ہوا فوج شاہؑ کا" کے مصائب یاد آتے ہیں۔ وہی منظر ہے کہ وقت اخیر ہے، امام تنہا ہیں، سامنے اصحاب و انصار و عزیزوں کے لاشے بکھرے پڑے ہیں۔ امام حضرت عباسؑ اور جناب علی اکبرؑ کے لاشوں سے مخاطب ہو کر گفتگو کر رہے ہیں، اسی منظر اور اسی مضمون کو طالب جوہری صاحب نے کس چابکدستی سے نظم کیا ہے۔ واہ واہ

مرثیہ "ہدایت" میں بھی حضرت کے مطلع کی بیت سے ہی شاعری کے ساتھ ساتھ علیت جو آپ کی صفت ثانیہ ہے کا اظہار ہو رہا ہے۔

تحریر کے قبضے میں ہو خشکی بھی تری بھی ‏ ہو معترف زور قلم دیدہ وری بھی

"ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین" کی یاد دلاتے ہوئے کیا خوبصورت تعلی ہے۔

غالبؔ سے وام لے گئے، مصرعے کس مہارت سے صرف ہوئے ہیں۔

ذرا یہ بند ملاحظہ فرمائیں۔

یہ ارض و سماوات کی ویران حویلی ‏ انسان اسی ویران حویلی کی چنبیلی
انسان کہ جس کا نہ کوئی یار نہ بیلی ‏ بوجھے نہ فرشتے بھی وہ دشوار پہیلی
اسما و معانی کے گہر رول رہا تھا
آفاق تھے خاموش بشر بول رہا تھا

کیا مندرجہ بالا بیت جوشؔ صاحب کی اس بیت کی یاد نہیں دلاتی۔

گرہ ارض و سماں کھول رہا ہے انساں ‏ اس خموشی میں فقط بول رہا ہے انساں

جوشؔ صاحب کی بیت میں صدر مصرع یعنی "گرہ" پڑھنے میں کچھ تکلف ہوتا ہے وجہ یہ ہے کہ گرہ کی و کے نیچے اضافت ہے۔ زبان میں ضغطہ ہوتا ہے جبکہ علامہ صاحب کی بیت بہت رواں ہے۔

منصوص من اللہ افراد کیلئے کہی گئی بیت کس قدر چست اور لطف آگیں ہے پڑھنے میں لطف آ گیا۔

پہرہ تھا مشیت کا ہر اک گام پہ ان کے ‏ عصمت کی قبا چست تھی اندام پہ ان کے

اسی طرح مرثیہ "ہدایت" بعد رسولؐ اسلام پر جو آفت آئی اور منافقین نے کس طرح روح اسلام کو

مجروح کیا اس کی تصویر کشی کتنی خوبصورتی سے کی ہے۔ بلاشبہ یہ بند جہاں جہاں اور جب جب پڑھا گیا۔ سامعین نے بار بار پڑھوایا۔

افلاک کی رفعت میں زمیں تانکنے والے ڈھول اپنی جہالت کی سدا پھانکنے والے
لوگوں کے دلوں میں عمداً جھانکنے والے بد مست حماروں کا جتھا ہانکنے والے
جبرئیل کے مولا پہ زباں کھول رہے ہیں
منہ زور مویشی کی طرح بول رہے ہیں

خاص کر اس بند کا پانچواں مصرعہ بلاغت کی انتہا ہے کہ وہ شخص جو جبرئیلؑ کا بھی ولی واستاد ہو جو مقرب بارگاہ فرشتہ ہو اس پر زبان کھولنا انتہائی جرأت وجہالت ہے۔

مگر یہ ساری بلاغت وفصاحت اور معنی آفرینی جب ہی ممکن ہے جب الفاظ کا انتخاب راست ہو۔ اکثر کہتے سُنا ہے کہ یہ لفظ مرثیہ کا نہیں، یہ غزل یا گیت کا لفظ ہے۔ یہ عام بول چال کا لفظ مرثیے کو زیب نہیں دیتا۔ مگر علامہ طالب جوہری نے ان ساری باتوں کی نفی کی ہے۔

عام بول چال اور غیر رثائی الفاظ کو استعمال کر کے بعض اساتذہ نے بھی یہ کام کیا ہے۔ مثلاً "ڑ" اور اس کے سابقے سے بنا ہوا لفظ "گاڑ" صوتی اعتبار سے ناپسندیدہ لفظ ہے۔ مگر میر عشق نے اس کو استعمال کر کے ذیل کی بیت کو لازوال بنا دیا۔

مٹھی سے قبر کھود کے اصغر کو گاڑ کے شیرؑ اٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

میر انیس نے اس لفظ کو یوں استعمال کیا۔

بیٹھے نہیں زمیں میں خزانے کو گاڑ کے موت آئی اٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے

بعینہ حضرت طالب جوہری نے عام بول چال میں استعمال ہونے والے ظاہراً غیر فصیح الفاظ کو اپنے مرثیوں میں استعمال کر کے انہیں اعتبار بخشا، ذرا یہ بند ملاحظہ ہو۔ جس سے حضرت کی فطری بذلہ سنجی اور خوش فکری دونوں نمایاں ہیں۔

پھر گلشنِ اسلام میں ہونے لگے پت جھڑ غنچوں کے شبستانوں میں چلنے لگے جھکڑ
بستی کو شریعت کی بنایا گیا بیہڑ تاریخ فقاہت میں اٹھے لال بھبھوکو

قانون کی گاڑی کو غلط کھینچنے والے
قرآن پہ تنسیخ کا خط کھینچنے والے

اسی طرح لفظ ''کھانچے'' فی زمانہ اپنے معنی ومفہوم سے بہت دُور نکل گیا ہے اور خاص کسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے لیکن جناب جوہری نے اس کو استعمال کر کے اصلی معنی ومفہوم واضح کر دیے۔

''پیدا ہوئے تہذیب کی راہوں میں جو کھانچے''

اس بند کی بیت کیا عمدہ ہے۔

دنیا میں جو یہ معرکۂ نسل و زباں ہے تہذیب کے چہرے پہ طمانچوں کا نشاں ہے

''پنگھٹ'' خاص گیت کا لفظ ہے مگر

پنگھٹ کے سویروں میں فضا جھوم رہی ہے

تاریخ انسانی کی ابتداء کی کیا خوبصورت منظر کشی اور ''پنگھٹ'' کا کیا خوبصورت صرف۔ عام نظموں، گیتوں حتیٰ کہ قصیدے میں اس کا استعمال ممکن ہے لیکن مرثیے میں اس لفظ کا صرف قادر الکلامی و جمالیات مانگتا ہے۔

قارئین کرام! اب دیکھتا ہوں تو مضمون طول پکڑتا جا رہا ہے۔ بقول میر مونس

مختصر بھی جو کروں عرض تو ہو جائے گا طول

اس لئے یہیں اختتام کرتا ہوں ورنہ حضرت علامہ طالب جوہری کے دونوں مرثیے اور ہر مرثیہ کا ہر بند اور ہر بند کا ہر مصرع ایک علیحدہ مضمون چاہتا ہے۔ فی الحال اتنا ہی۔

اب یہ صفحات فرحان سلمہ کے حوالے کرتا ہوں۔

خدا فرحان رضا صاحب کو سلامت رکھے، شاد و آباد رکھے اور علمی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

والسلام

سید جاوید حسن

فروری ۲۰۲۰

maablib.org

# مرثیہ، منبر اور فروغِ مرثیہ

## (اصغر مہدی اشعر)

مرثیہ عربی کے لفظ "رثاء" سے مشتق ہے، زیادہ تر لغات میں اس کے معنی "مردے کے اوصاف اور اس کی شہادت کا بیان" کی عبارت میں دیئے گئے ہیں، خصوصاً سید الشہداؑ اور ان کے اصحاب کی شہادت کے ذکر کو عرفِ عام میں مرثیہ کہا جاتا ہے۔

وہ مولا علیؑ کا کہا ہوا مرثیہ ہو یا جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کا مرثیے کی زبانی اپنے مصائب کا اظہار وہ بنتِ عقیل ابن ابی طالب کے مرثیے کی صورت یزیدی فوج سے جواب طلبی ہو یا جناب زینبؑ و امام زین العابدینؑ کا کوفہ و شام کی راہ میں حق کا پرچار، مرثیے نے ہمیشہ باطل کی سیاہ رات کو حق کے سورج سے منور کیا ہے۔ مرثیہ پچھلے چودہ سو سالوں سے علمِ حق بلند کئے ہوئے ہے اور جس ذکر اور پیغام کو چھپانے کی خاطر باطل نے اپنی تمام محنتیں، وسائل اور نسلیں صرف کر دیں، اسی پیغام کو مرثیے نے ہر دور میں برسرِ منبر بیان کیا، شاید یہی وجہ ہے کہ امام علی رضا علیہ السلام نے دعبل خزاعی سے فرمایا

"اے دعبل!

حسینؑ ابن علیؑ کے لئے مرثیہ پڑھو، تم جب تک زندہ رہو ہمارے مددگار اور مدح خواں رہو اور جتنا ممکن ہو سکے ہمارے ذکر سے کوتاہی نہ کرو"۔

جامع احادیث الشیعہ، ج ۱۲، ص ۵۶۷

وہ مولا علیؑ ہوں یا جناب زہراؑ، دعبل خزاعی ہوں، نصرتی ہوں، بیجاپوری ہوں کہ بیابانی، سکندر پنجابی ہوں کہ عظیم شاہ جہاں آبادی، ضمیر ہوں کہ خلیق، دبیر ہوں کہ انیس، جوش ہوں، نسیم ہوں، صبا ہوں، سردار ہوں، ساحر ہوں یا ہلال، پچھلے چودہ سو سال سے مرثیہ ظلم اور باطل کو ان کے انجام سے ہم کنار کرتا چلا آ رہا ہے۔ ہر دور اور ہر زمان میں اس دور کی علمی اور ادبی شخصیات نے مرثیے کا دامن تھاما۔

وہ مرثیہ جو صرف شاعری نہیں بلکہ ایک تحریک ہے جو آج تک ظلمتوں کے خاتمے کے لئے حق کا علم سربلند کئے ہوئے ہے، یہی وجہ ہے کہ مرثیے کا فروغ صرف مرثیے کا فروغ نہیں بلکہ فروغ حق کے ساتھ فروغ عزا بھی ہے۔

برادرم فرحان رضا کی یہ تیسری تصنیف / مرتب کردہ کتاب ہے۔ فن تحت خوانی پر ان کی پہلی کتاب تحت اللفظ خوانی، ایک فنی مطالعہ مرثیے کے طالب علموں کے لئے ایک بہترین کتاب ہے، دوسری کتاب جوہر شناسی بیاد آیت اللہ محمد مصطفےٰ جوہر (والد محترم علامہ طالب جوہری) اور یہ تیسری کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ جو علامہ طالب جوہری کے رثائی کلام و بیان پر مشتمل ہے۔

علمائے دین کا مرثیے سے تعلق کوئی نامانوس امر نہیں۔ ہمارے علماء مرثیے کے ہمیشہ قدر دان رہے ہیں۔ علامہ رشید ترابی منبر کے ذریعے مرثیے کو ہزاروں سامعین تک پہنچاتے رہے ہیں، مرثیے کے وہ گوشے جو عوام الناس کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے منبر کی بدولت عوام ان تک پہنچے۔

علامہ طالب جوہری نے اپنے رثائی کلام کے ذریعے اسی سلسلے اور روایت سے اپنا رشتہ استوار کیا۔ ''وجود باری تعالیٰ'' اور ''ہدایت'' جو کہ بحر مضارع اور بحر ہزج میں لکھے گئے ہیں، لفظیات کا ایک تازہ نظام سموئے ہوئے ہیں جو نہایت اثر انگیز اور پُر تاثیر ہے۔

انیس کے کلام تشبیہات سے پُر جب کہ دبیر کے مرثیوں میں استعارات کا استعمال زیادہ ہے۔ علامہ طالب جوہری کا مرثیہ ''ہدایت'' استعارات سے پُر ہے اور جوشیت اور دبیریت کا احساس دلاتا ہے جبکہ وجود باری تعالیٰ اپنے اندر وہ نغمگی و روانی لئے ہوئے ہے جو انیسیت کا ہی خاصہ ہے۔

قبلہ جاوید حسن کی زبانی ان دونوں مرثیوں کی نغمگی روح تک پہنچی اور علامہ طالب جوہری کی قادرالکلامی نثر کے بعد نظم کی صورت روح کو جھنجھوڑتی چلی گئی۔ زبان و بیان کی قدرت سے تو سب واقف ہیں مگر یہ زبان آوری، زبان آوران شعروادب میں نمایاں مقام کی حقدار ہے۔

علامہ طالب جوہری کا رثائی کلام فروغ مرثیہ کا باعث ہے جو ہر دور کی ضرورت ہے۔ فروغ مرثیہ وہ علم حق ہے جو مرثیے سے محبت رکھنے والے ہر فرد کو آپس میں جوڑنے کا باعث ہے۔ کینیڈا سے شروع ہونے والی یہ تحریک دنیا بھر میں پھیل چکی ہے۔ وہ مرثیہ جو پچھلے پانچ سو سال سے اپنا مقام ڈھونڈ

رہا ہے، آج گھر گھر پھیل رہا ہے۔ اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ کہنا انتہائی ضروری ہے کہ آج کل کے دور میں نوجوان مرثیے کی جانب زیادہ راغب ہو رہے ہیں۔ Digitalization کے اس دور میں مرثیہ کتابوں سے نکل کر Soft Copies میں منتقل ہو کر ہر گھر اور ہر دروازے پر دستک دے رہا ہے، وہ مراثی ہوں کہ تحت اللفظ مرثیے کی مجالس، فروغِ مرثیہ کے پلیٹ فارم سے ہر خاص و عام کے لئے ہر وقت مہیا ہیں، دو سو سے زائد مرثیہ نگار تقریباً تین ہزار مکمل مراثی کے ذریعے مرثیے سے چاہت رکھنے والے ہر فرد کا دل موہ لے رہے ہیں۔ تحت اللفظ خوانی کے نئے عشرے بڑھتے جا رہے ہیں اور خود قبلہ طالب جوہری اپنے دولت کدے پر مرثیے کی محافل کا انعقاد کر کے یہ پیغام دے رہے ہیں کہ ہمارے عالموں نے ہمیشہ فروغِ مرثیہ کا علم منبر سے بلند کیا، اس پیغام کے ساتھ کہ جب تک خدا کا ملک قائم ہے، اس کے مالک کے غم کو زندہ رکھنے والا مرثیہ زندہ رہے گا۔

کس منزلِ نیاز کے سالک حسینؑ ہیں
جب تک خدا کا ملک ہے مالک حسینؑ ہیں
"دبیرؔ"

احقر

اصغر مہدی اشعر

# استغاثہ بحضورِ امام زمانہؑ

اے امیرِ ابد اے سفیرِ ازل خاندانِ محمدؐ کے دل کے کنول
ہر اولی العزم ہادی کے نعم البدل شجرۂ طیبہ کی ریاضت کے پھل
اے ضمیرِ مشیت کے ارماں ۔۔۔ نکل
العجل، العجل، العجل، العجل

گلستانوں پہ ہیں حکم راں خار و خس روح کا قافلہ گم رہی کا جرس
کتنی پیاسی ہے یہ سر زمینِ نفس اے سحابِ مشیت کے پانی برس
کتنے دہقاں اٹھائے ہیں کاندھوں پہ ہل
العجل، العجل، العجل، العجل

یوں تو موسم کے تیور بگڑتے رہے بادبانوں سے طوفاں جھگڑتے رہے
پھر بھی منجھی سمندر سے لڑتے رہے ہم ترا نام لے کے اکڑتے رہے
پھر نمایاں ہیں موسم کی تیوری پہ بل
العجل، العجل، العجل، العجل

میرے ماں باپ قرباں ترے نام پر آج پھر دین و مذہب ہیں نیلام پر
مفتیوں کا اجارہ ہے اسلام پر حق کو تیری ضرورت ہے ہر گام پر
اے عمل، اے خداوندِ ردِّ عمل
العجل، العجل، العجل، العجل

لشکروں کی کڑکتی کمانیں بھی ہیں انتخابات قومی کی تانیں بھی ہیں
دیں فروشی کی خاطر دکانیں بھی ہیں مسجدوں میں مسلسل اذانیں بھی ہیں
گم ہے دنیا میں آواز خیر العمل
العجل، العجل، العجل، العجل

یوں تو ہر مردِ مومن خطا کار ہے پھر بھی عفو و کرم کا سزاوار ہے
تیرے در کا بھکاری ہے نادار ہے طالب جوہری بھی تیرا نمک خوار ہے
اس کی ساری خطاؤں کو کر دے نکل
العجل، العجل، العجل، العجل

اے ابو طالب ذی حشم کے پسر اے اولو الامر، اے مہدئ منتظر
نوکِ نیزہ پہ ٹھہرا ہوا ایک سر دستِ ہندہ میں حمزہؑ کا خونیں جگر
تجھ کو آواز دیتا ہے ہر ایک پل
العجل، العجل، العجل، العجل

☆☆☆☆☆

maablib.org

# سلام

جز علیؑ ہوتا اگر بعدِ پیمبرؐ دوسرا
وہ بھی پا لیتا شبِ ہجرت کا بستر دوسرا

اوّلِ مخلوق کی نسبت سے ٹوٹا یہ اصول
نقش ہوتا ہے سوا پہلے سے بہتر دوسرا

اک ابوذر تھا کہ تھا حیدرؑ کی چوکھٹ کا غلام
اب کہاں سے لائے گی دنیا ابوذر دوسرا

اُمِ سلمیٰ! یہ حصارِ آیۂ تطہیر ہے
آ نہیں سکتا کوئی اب زیرِ چادر دوسرا

مل گیا کرار کا منصب علیؑ کو مل گیا
اب نہ حیدرؑ دوسرا ہے اور نہ خیبر دوسرا

خواہشِ جنت علیؑ سے دوسروں سے دوستی
بے یقینو! جاؤ اب دیکھو کوئی در دوسرا

اب علیؑ کو اپنا مولا مان لے اور صبر کر
بن نہ پائے گا غدیرِ خم کا منبر دوسرا

اپنے سر کو خود اٹھا لیتا ہے ہر سجدہ گزار
جو نہ سجدے سے اٹھے خود سے وہ ہے سر دوسرا

وہ اٹھی تیغ حسینؑ ابن علیؑ جنگاہ میں
رکھ دو اے جبرئیل زیرِ تیغ شہپر دوسرا

میں سرِ فرشِ عزا ہوں میری آنکھوں میں ہے اشک
میری جنت دوسری ہے میرا کوثر دوسرا

دے تو دی بیٹے کو مقتل کی اجازت اے حسینؑ
اُم لیلیٰ اب کہاں پائے گی اکبرؑ دوسرا

☆☆☆☆☆

maablib.org

# سلام

دشتِ بلا میں کوثر والے کب محتاج تھے پانی کے
جنگل جنگل شاخِ سناں پر پھول کھلے قربانی کے

منبرِ خم پر آج نبیؑ کے ساتھ علیؑ کیوں بیٹھے ہیں
جانے پہچانے چہروں پہ بادل ہیں حیرانی کے

لب کی تلخی کم کر دی ہے یوں تو مبارک بادوں نے
دے نہ سکیں گے ساتھ زباں کا لیکن بل پیشانی کے

پھر نہ کسی نے بیعت مانگی علمِ نبیؑ کے دروازوں سے
دانائی نے سارے سانچے توڑ دیئے نادانی کے

باپ نے اپنے آنسو چھڑکے سوکھی قبر پہ بیٹے کی
ایسے موقعے کب دیکھے ہیں دنیا نے اشک فشانی کے

☆☆☆☆☆

# سلام

جو بھی میرے مرتضیٰ کی شان ہے
ماورائے قدرتِ انسان ہے

دوشِ پیغمبرؐ کی رفعت پہ علیؑ
اصطفا کی رحل پہ قرآن ہے

حبِ حیدرؑ سے پتہ چل جائے گا
کس کو کتنا دین کا عرفان ہے

ذکرِ حیدرؑ سے مکدّر ہو گیا
کیا منافق کی یہی پہچان ہے

دشت میں ہے اک فتیٰ اور ایک سیف
اور خالی جنگ کا میدان ہے

کتنی آبادی تھی عاشورہ سے قبل
کربلا اب اس قدر ویران ہے

سجدہ شہؑ کو ترازو میں نہ تول
یہ وہ سجدہ ہے جو خود میزان ہے

بیبیوں کی سر کی چادر بن گئی
شب کی تاریکی ترا احسان ہے

اور سب ہیں صرف اک بچی نہیں
کتنا ویراں شام کا زندان ہے

موت اے موت اِن سے اکبرؑ کو نہ چھین
یہ جواں اہلِ حرم کی جان ہے

☆☆☆☆☆

# سلام

جو بھی راہِ علم و عمل میں پیروِ فکرِ بوذر ہو گا
بر میں دلقِ فقیری ہو گا، وردِ زباں یا حیدرؑ ہو گا

الفت کرنا، نفرت کرنا اک جذبے کے دو پہلو ہیں
جادۂ ابراہیم کا رہرو، دشمنِ فکرِ آذر ہو گا

دنیا میں بے حسّ رہے گی ایسی بلندی ایسی پستی
میرے قول پہ صاد کرے گا جو بھی یہاں دانشور ہو گا

بائے بسم اللہ نیچے نقطہ بن کر آنے والا
شمعِ نبوت کی لو بن کر دوشِ نبیؐ کے اوپر ہو گا

خانۂ زہراؑ کی چوکھٹ پر ٹوٹ کے آنے والا ستارہ
کچھ آنکھوں میں چاند بنے گا کچھ آنکھوں میں خنجر ہو گا

ذہنِ نبیؐ کو ہر حالت میں مرکزِ وحیِ الٰہی جانو
اس پہ جو الزام دھرو گے وہ الزام خدا پر ہو گا

استحقاقِ علمبرداری پر خیبر میں فرمانِ نبیؐ ہوا
اس کو ملے گا علم جس میں کراری کا جوہر ہو گا

وہ دیکھو شبیرؑ نے سونپا اپنا پرچم ایک جری کو
حیدرؑ سے تیور ملتے ہیں وہ عباسؑ دلاور ہو گا

روم و شام کی فوجیں سن لیں لڑنے کو وہ شخص چلا ہے
دیکھو گے تو فرد لگے گا الجھو گے تو لشکر ہو گا

☆☆☆☆☆

maablib.org

# سلام

ہم کو کرسی نہ جاہ و حشم چاہیئے، ہم کو دولت نہ دولت سرا چاہیئے
وہ خدا جو محمدؐ کی پہچان ہے، اس خدا کی اک ادنیٰ رضا چاہیئے

لوگ منزل کی جانب چلے تھے مگر بے یقینی کے جنگل میں گم ہو گئے
کون ان کو بتائے کہ اس راہ میں آج بھی معتبر رہنما چاہیئے

یہ علی یہ ولی یہ رجل یہ وصی سب کا مولیٰ بھی ہے کلِ ایماں بھی ہے
جتنے ممکن تھے الفاظ سب کہہ دیئے ناشناسوں کو اب اور کیا چاہیئے

لفظ مولیٰ کے بائیس معنی سہی لفظ بخٍ کے معنی معین کرو
کلمہ گویوں کے اس حرفِ تبریک پر آپ کو بھی تو کچھ پوچھنا چاہیئے

شمع جب خیمۂ شاہ میں گل ہوئی نور پھیلا امامت کی آواز کا
وہ چلا جائے جس کو بچانی ہو جاں وہ رکے جس کو آپ بقا چاہیئے

انقلابِ زمانہ تجھے کیا کہوں جس کی پرچھائی سورج نے دیکھی نہ تھی
شام کے اک نحوست بھرے شہر میں اس کی بیٹی کے سر کو ردا چاہیئے

☆☆☆☆☆

# وجودِ باری تعالیٰ

علامہ طالب جوہری

۱۔

جب کُن ادا کیا لبِ حکمت خطاب نے
لی راہ نیستی کی عدم کے سراب نے
رکھا قدم وجود میں امکاں مآب نے
"یا قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے"
جلوہ ہر ایک فردِ خفی و جلی پہ تھا
نورِ محمدیؐ افقِ زندگی پہ تھا

۲۔

نکلی جو دھوپ دن میں ستارے بکھر گئے
ہر گوشۂ فضا میں شرارے بکھر گئے
تحریک زندگی کے اشارے بکھر گئے
آفاق کی کتاب کے پارے بکھر گئے
ہر جذب و دفع۔ ثقل و کشش کا سبب بنا
لیں کروٹیں تو سلسلۂ روز و شب بنا

۔۳۔

پھیلی فضا کی سطح پہ سورج کی روشنی
ڈوبی خلا کی تہ میں ستاروں کی زندگی
لرزی جبال و دشت و بیاباں پہ چاندنی
اُمڈی مُہیب غار پہ راتوں کی تیرگی
یہ سلسلہ بڑھا تو منازل بدل گئے
دن رات ماہ و سال کے سانچے میں ڈھل گئے

۔۴۔

پیدا ہوا کچھ اور جو گردش میں بانکپن
موسم ہوئے زمین کی وسعت پہ خیمہ زن
سجنے لگے بدن پہ سدا رنگ پیرہن
نہر و جبال و چشمۂ و دشت و در و دمن
پت جھڑ ہوا تو ایک اُداسی سے چھا گئی
بوندیں پڑیں تو ساری فضا لہلہا گئی

۔۵۔

گرمی بڑھی تو آگ لگی کائنات میں
کرنوں کے تیر چلنے لگے شش جہات میں
اجسام کو اماں ہے نہ دن میں نہ رات میں
چھالے پڑے ہیں دھوپ سے پائے حیات میں
شعلے برس رہے ہیں فضائے اثیر سے
اِک لَو نکل رہی ہے دلِ زمہریر سے

۶۔

آئی بہار لے کے ہتھیلی پہ نقدِ زر
جھومے ہر ایک شاخ پہ برگ و گل و ثمر
آسودگیٔ ذوق نظر تا حدِ نظر
بکھرے ہوئے ہیں چار طرف تتلیوں کے پر
ہر خطۂ زمیں جو نظارہ شکار ہے
دامانِ کوہسار و لبِ جوئبار ہے

۷۔

یہ رُت یہ مستیاں یہ ہوائیں مگر اُداس
یہ کوہ دشت و دریہ گھٹائیں مگر اُداس
یہ نغمہ سنجیاں یہ ادائیں مگر اُداس
بھرپور زندگی کی فضائیں مگر اُداس
اک بیکراں جمود سا ہے ماوطین پر
بے کیفیاں محیط ہیں پوری زمین پر

۸۔

اُجڑی ہوئی زمیں پہ ہیں کیف برگ و بار
ہے ساری کائنات کو اِک کربِ انتظار
ناگاہ آسماں سے اُڑی گردِ زر نگار
ٹوٹا حریم ہستیٔ مطلق سے اِک شرار
اُترا تو رنگِ محفلِ ہستی پہ چھا گیا
انسان کائنات کا دل بن کے آ گیا

۔۹۔

پھینکی کمندِ تارِ نظر کائنات پر
پھیلایا دامِ ذوقِ تجسس جہات پر
ٹھہرا گیا نہ فکر سے احساسِ ذات پر
عرفان نے جما دیں نگاہیں صفات پر
رستہ صفات و ذات کا یوں مختصر ہوا
جبریلِ فکر سوئے خدا راہبر ہوا

۔۱۰۔

گر کیجئے سماج کی رسموں کا تجزیہ
مُجز ہے معاشرہ کا یہ ادنیٰ سا قاعدہ
مُنعم کی اِک عطا پہ بھی لازم ہے شکریہ
یہ رشتۂ نفس جو ہوا ہے ہمیں عطا
صرف اس کی سمت چشمِ تعقّل جو وا کریں
لازم ہے یہ کہ شکرِ مسلسل ادا کریں

۔۱۱۔

لیکن اَدائے شکر کی ہے ایک شرط بھی
یعنی عُلوئے رُتبۂ مُنعم سے آگہی
اس آگہی کے رو سے ہے یہ اَمر لازمی
اسلوبِ شکر میں نہ جھلک آئے ہتک کی
یہ مقتضائے فکر و نظر کی حیات کا
ہر شخص پر وجوب ہے عرفانِ ذات کا

۱۲۔

ہے حکمِ عقل۔ خلق ہے خالی صفات سے
محتاجِ وصف ہے یہ جہاں کُل جہات سے
پاتا ہے فیض۔ منبعِ توحیدِ ذات سے
وہ ذات ماوراء ہے جو کل ممکنات سے

ذات و صفت کا فرق جہاں پہ محال ہے
ازروئے فلسفہ جو سراسر کمال ہے

۱۳۔

ہے فلسفہ تجسسِ اسرارِ کائنات
لیکن بقدرِ طاقتِ انساں تجسسات
اِک خطِ مستقیم میں تحقیقِ مادیات
اور نقطۂ اخیر پہ بحثِ وجودِ ذات

تاریک آسماں پہ مہرِ یقین ہے
منزل گہِ وجود میں اِک خوردبین ہے

۱۴۔

پیچیدہ ماورائے طبیعت کا مسئلہ
ہر گام و ہر نفس ہے حریفِ مغالطہ
قبل اس کے ناگزیر ہے اک اور مرحلہ
یعنی خطائے فکر سے بچنے کا قاعدہ

جس کے بغیر فکر کی ہر جست خام ہے
منطق صحیح طرزِ تفکر کا نام ہے

۱۵۔

اثبات و نفی کا ہے یہ اک صاف مسئلہ
موجود صرف دو ہیں نہیں کوئی تیسرا
ہے اک قدیم جس کا نہ مبدأ نہ منتہا
اور دوسرا عدم سے وجود آشنا ہوا
اِک واجب الوجود نقائص سے پاک ہے
اور دوسرا حدوث کی مٹی میں خاک ہے

۱۶۔

ہوتا ہے یہ وجود کی تقسیم سے عیاں
وہ منحصر ہے واجب و ممکن میں بے گماں
اب مسئلہ یہ ہے کہ یہ پھیلا ہوا جہاں
واجب ہے یا کہ ہے حدِ امکاں کے درمیاں
واجب۔ کہ جو ازل سے ابد تک محیط ہے
اِک بحرِ بے کنار ہے لیکن بسیط ہے

۱۷۔

ممکن کے قبل و بعد عدم کا ہے اِک حصار
اور ہر طرف محیط زمانے کا اقتدار
ہستی و نیستی سے جو ہر وقت ہے دوچار
جس سے کہ احتیاج مکاں بھی ہے آشکار
واجب۔ کہ جس کے قبل۔ وجودِ عدم نہیں
جو سرمدی ہے یعنی جدا از قدم نہیں

-۱۸-

واجب کہ جس کی ذات ہے اِک مستقل کمال
ہر وصف جس کی ذات کا بے نقص و لازوال
جس میں نہ احتیاج و طلب کا ہے احتمال
ممکن کہ ہے تغیرِ پیہم سے خوش جمال
ہر آن رہروِ سفرِ ارتقاء ہے یہ
جس حال میں بھی ہو حرکت آشنا ہے یہ

-۱۹-

جیسے کہ ایک بیج زمیں کے کنار میں
کونپل کا روپ دھار کے فصلِ بہار میں
مشغولِ کار ہے سفرِ برگ و بار میں
پھر بیج بن کے ما حصلِ کاشتکار میں
قانونِ ارتقاء کی تہیں کھولتا ہوا
صدیوں سے ہے دلیلِ تغیر بنا ہوا

-۲۰-

انسان کل تھے صُلب کی ظلمت میں محوِ خواب
اور آنے والے کل میں یہ ہوں گے تہِ تراب
پھر زیرِ خاک جسم کے ذرّوں کا پیچ و تاب
اِک دن اگائے گا کہیں خطل کہیں گلاب
مقدار و کیفیات کے ہر بیش و کم کے ساتھ
شکلِ قدیم گرمِ سفر ہے عدم کے ساتھ

۲۱۔

دنیا میں گاہ صبح ہے اور گاہ شام ہے
جس میں تغیرات ہوں وہ لا دوام ہے
تغیر اور حدوث میں اِک التزام ہے
حرکت اسی تغیرِ پیہم کا نام ہے
تغیر ماہیت حرکت کی دلیل ہے
پیمائشِ زماں کے لئے سنگِ میل ہے

۲۲۔

تعریفِ وقت یہ ہے کہ لمحات ہوں بہم
ماضی عدم۔ زمانۂ آئندہ بھی عدم
دونوں کے درمیاں جو نفس لے رہے ہیں ہم
اس لمحے کا وجود دقیقے سے بھی ہے کم
اِک ثانیے کے طول میں یہ جسم و جان ہے
انسان کا وجود فقط ایک آن ہے

۲۳۔

بالکل اسی طرح سے ہے یہ ساری کائنات
اس کو عطا ہوئی ہے بس اِک آن کی حیات
یعنی فروغِ شعلۂ خس کی طرح ثبات
جگنو کی روشنی پہ مُسلط سیاہ رات
ہر چیز استعارۂ امید و بیم ہے
اُس پر یہ اِدّعا ہے کہ عالم قدیم ہے

۲۴۔

عالم کا ہے علاقۂ تسبیب پہ مدار
ہر شے ہے اپنے قبل کی علت سے آشکار
وہ دورۂ خزاں ہو کہ ہو موسمِ بہار
کوئی بھی بے سبب نہیں آتا ہے بار بار
کوئی سبب ضرور ہے ہر کار گاہ کا
یہ منطقی سبب ہے وجودِ الٰہ کا

۲۵۔

علم و ارادہ۔ قدر و قضاء۔ غیبت وشہود
امکان و افضلیت و علیت و وجود
خلق و تصوریت و مختاری و قیود
عقل و دلیل و رد و قبول و زیاں و سود
معیارِ حق ہیں مظہرِ لطفِ الٰہ ہیں
یہ واجب الوجود کے سارے گواہ ہیں

۲۶۔

ہر شے کی ابتداء ہے بفحوائے کاف و نوں
ہر چیز پہ محیط ہے اعداد کا فسوں
با وصفِ احتیاج سوئے حرکت و سکوں
انکار ایک جہل ہے تشکیک اک جنوں
وقت و مکان و شکل و جہت کا اسیر ہے
منکر ہی خود وجودِ خدا کا سفیر ہے

۲۷۔

اس نظمِ و ہست و بود پہ ایمان چاہیئے
ہنگامۂ وجود کا ایقان چاہیئے
احساس اپنی ذات کا ہر آن چاہیئے
یعنی خود اپنے نفس کا عرفان چاہیئے
عرفانِ نفس شیخ گن گری بنے
خود آگہی ابھر کے خدا آگہی بنے

۲۸۔

نامِ خدا ہے باعثِ ایجادِ کائنات
رحمت ہے اس کی منبعِ ارشادِ کائنات
اور تربیت ہے قوتِ بنیادِ کائنات
اس پہ مزید رحمتِ امدادِ کائنات
راہِ نجات تفرقۂ خیر و شر پہ ہے
اور یومِ دین فیصلۂ ہر بشر پہ ہے

۲۹۔

معبود سے ہے عبد کا اب اس طرح خطاب
ہم تیری بندگی و اعانت سے بہرہ یاب
خواہاں ہیں ہم سے چھوٹے نہ ہرگز رہِ صواب
رہ ان کی جن پہ ہے ترا انعام بے حساب
جو تیرے عبد۔ راہنما تیرے دین کے
مغضوب کے جو غیر ہیں اور ضالین کے

۔۳۰

دستورِ اعتقاد و عمل ہے یہ قولِ حق
جو مکتبِ حیات کا ہے اوّلیں سبق
اوراقِ کائنات کا جامع بس اک ورق
الفاظ جس کے سہل مضامیں بہت ادق
جس کا بیاں نفس کے تسلسل کے ساتھ ہے
تفسیر جس کی ذوقِ تفکّر کے ساتھ ہے

۔۳۱

توحید ہے سبق شرفِ کائنات کا
فرضِ عظیم عارفِ ذات و صفات کا
نذرِ وجوب فدیہ ہے کُل ممکنات کا
مقصد ہے جو حسینؑ کے ذوقِ حیات کا
یعنی رُخِ حیات پہ تابندگی رہے
سَر جسم سے جُدا ہو مگر زندگی رہے

۔۳۲

یہ درس گاہِ عقل کا ہے اوّلیں اصول
صرف اس کی معرفت پہ مکلّف ہوئے عقول
کرتا رہا اسی کو اُجاگر ہر اِک رسولؐ
بے شک یہی تھا مقصدِ تربیتِ بتولؑ
لاریب یہ اصول ہی عزمِ حسینؑ تھا
تحریکِ کربلا کا یہی نصب عین تھا

۳۳۔

اِک داغ بن کے سینۂ دانشوراں میں ہے
وہ داستاں جو سرِ ورق داستاں میں ہے
ہر بات پھر بھی پردۂ سرِّ نہاں میں ہے
ہم کیا کریں کہ قفل ہماری زباں میں ہے
واضح سا معجزہ ہے یہ اقدامِ شاہ کا
پھر عیب چھپ سکا نہ کسی روسیاہ کا

۳۴۔

تاریخ کائنات کے ہر زیرو بم کے ساتھ
لرزاں و خونچکاں ہیں ہزاروں ہی حادثات
لیکن وہ حادثہ جو ہوا تھا لبِ فرات
اپنے جلو میں لے کے چلا سرمدی حیات
وہ حادثہ جو اک ابدی تیغ بن گیا
یعنی صریرِ خامۂ تاریخ بن گیا

۳۵۔

منہاجِ حق و صدق کے سالک جو تھے حسینؑ
اِک عزمِ لازوال سے بڑھتے رہے حسینؑ
کس ولولے سے راہِ رضا پر چلے حسینؑ
ہر حدِّ امتحان سے آگے گئے حسینؑ
خود سارے کرب جھیل کے صبر و قرار سے
انساں کو دی نجات غمِ روزگار سے

۳۶۔

ذکرِ حسینؑ ہے سببِ قوتِ شعور
حاصل ہے اس کے فیض سے صد وسعتِ شعور
تاب و تواں بھی ہے پئے ہمتِ شعور
بڑھتا ہے اس سے دائرۂ قدرتِ شعور
لیکن بیانِ گرم کسی دم نہ سرد ہو
پیدا ہر ایک رنگ سے اندازِ درد ہو

۳۷۔

مفہوم کی بہار معانی کے شاخسار
الفاظ کی جبال کنایوں کے آبشار
زورِ بیاں کے دشت۔ زباں آوری کی غار
افکار کی نبرد۔ صنائع کی کارزار
دنیائے شعریت ہے مُسدّس میں کیا نہیں
وہ اصطلاحِ فن میں مگر مرثیہ نہیں

۳۸۔

گو پاک ہو حسام و سمند و نبرد سے
خالی نہ ہو کبھی وہ مضامینِ درد سے
ہر لفظ مستعار رہے آہِ سرد سے
میدانِ مرثیہ متقاضی ہے مَرد سے
یہ شاعری ذریعۂ ابلاغِ فکر ہو
اسلام کا بیان محمدؐ کا ذکر ہو

۳۹۔

گو زیرِ بحث آئیں علومِ معاشرت
لیکن اُصولِ دیں سے ہو اُن کی مفاہمت
اُسلوبِ پیشکش میں رہے طرزِ مرشیت
چھائی رہے مزاجِ سخن پر حسینیت
دین و ادب کے بیچ کی سرحد ہے دوستو
یہ درس گاہِ فکرِ محمدؐ ہے دوستو

۴۰۔

عرفاں طرازیاں ہیں اسی درس گاہ میں
ہمت نوازیاں ہیں اسی درس گاہ میں
فطرت گذاریاں ہیں اسی درس گاہ میں
کُل کارسازیاں ہیں اسی درس گاہ میں
وہ مدرسہ کہ جس پہ مَلک کا نزول ہے
وہ مدرسہ کہ جس کا معلّم رسول ہے

۴۱۔

اس مدرسہ نے ذہن کو بخشے ہیں یہ نکات
قائم ہے اعتدال و توازن پہ یہ حیات
دو زاویوں پہ گھوم رہی ہے یہ کائنات
اِک رُخ پہ اختیار ہے اِک رُخ پہ جبرِ ذات
دونوں کے درمیان بشر۔ گرمِ کار ہے
اور گرمیٔ عمل کا اِسی پہ مدار ہے

۴۲۔

ہو فطرتِ بشر پہ اگر جبر کا اثر
بیکار ہے عطائے تعقّل بہ بشر
بے فائدہ ہے قوتِ تمیز خیر و شر
پھر عرصۂ حیات ہے شیطاں کی رہگذر
گر جبر ہر فساد کا محکم جواز ہے
بتلاؤ نور و نار میں کیا امتیاز ہے

۴۳۔

لیکن یہ حکمِ فطرتِ عاقل ہے برقرار
انصاف پر سماج کی قدروں کا ہے مدار
حکّامِ عدل کا ہے یہی آج تک شعار
آئے گا احتساب کی زد پر جریمہ کار
کہہ دو کہ یہ مخالفِ عقلِ سلیم ہے
مجبور سے مواخذہ جرمِ عظیم ہے

۴۴۔

گر جبر ہے تو امن کے دھارے کو موڑ دو
جائز عدالتوں کی کلائی مروڑ دو
تعظیم و احترام سے چوروں کو چھوڑ دو
مجرم سے غدر چاہ کے زنداں کو توڑ دو
اک واسطہ ہے راہزن و رہنما کا ہاتھ
ہے ہولناک جرم کے پیچھے خدا کا ہاتھ

۳۵۔

سمجھو کہ عدلِ محض ہے جابر خدا نہیں
مجبور سازِ مومن و کافر خدا نہیں
ہمت فزائے فاسق و فاجر خدا نہیں
مجبور کو سزا دے وہ قاہر خدا نہیں
سوچو اگر طہارتِ عقل و شعور ہے
یہ اعتقاد عدل سے خود کتنا دور ہے

۳۶۔

شرعِ محمدیؐ کا اٹل ہے یہ فیصلہ
ایمان و کفر طوقِ بشر میں ہیں برملا
عقدہ یہ ہم پہ ناخنِ توحید سے کھلا
روکو اُسے جو کفر کی کج راہ پہ چلا
کردارِ بد سے روک رہے ہیں یزید کو
دیکھو حسینؑ ٹوک رہے ہیں یزید کو

۳۷۔

جس کو نہ پاسِ حق نہ پیمبرؐ کا احترام
اس کے دل و دماغ نے یہ باندھا خیالِ خام
قبضہ میں لے کے مذہبِ اسلام کی زمام
برداشت کر سکا نہ اُسے وقت کا امام
قلبِ علیؑ کی طاقتِ بے حد لئے ہوئے
اُٹھے حسینؑ عقلِ محمدؐ لئے ہوئے

۴۸۔

یثرب سے نکلے اور حرمِ کبریا میں آئے
کعبہ کو الوداع کہا کربلا میں آئے
دینِ خدا کو لے کے حصارِ بقا میں آئے
مثلِ رسولؐ رہگذرِ ابتلا میں آئے

پایا جو طورِ مرتضیٰؑ داورِ حسینؑ نے
عاشور کو لٹا دیا سب گھر حسینؑ نے

۴۹۔

دریا لہو کا ہے متلاطم یہاں وہاں
پتوار ہے بنا ہوا عباسؑ کا نشاں
پھیلا ہوا ہے چادرِ زینبؑ کا بادباں
کشتی ہے نورِ آلِ محمدؐ کی یوں رواں

پہرہ لگا دو روک لو رستہ فرات کا
خشکی میں چل رہا ہے سفینہ نجات کا

۵۰۔

میدان کے نشیب میں وہ عشق کی نماز
قربان جس نماز پہ معراج کا فراز
لہجہ میں وہ خضوع وہ آواز میں گداز
کہہ دو کہ ایک ہے وہ خداوند بے نیاز

وہ رب جو رشتہ ہائے توالد سے پاک ہے
دعوائے ہمسری جو کرے اس پہ خاک ہے

۵۱۔

تنہا کھڑے ہیں دشتِ پُر آشوب میں امام
فرماتے ہیں کہاں گئے اصحابِ نیک نام
عباسؑ! ہم سے ہاشمیوں کے سبھی تمام
ہم دشت میں ہیں تم نے کیا خلد میں مقام
گھبراتے ہو گے خلدِ لطافت نہاد میں
پانی پیا نہ ہو گا سکینہؑ کی یاد میں

۵۲۔

افسوس تم بھی چھوڑ گئے اکبرؑ جواں
آؤ کہ چار سمت سے گھیرے ہیں بد گماں
گھوڑے سے گر رہا ہوں سنبھالو پدر کی جاں
دیکھو کہ لے رہی ہے میری عمر ہچکیاں
بے تاب ہوں تری کوئی پہنچا دو حلق میں
دو چار قطرے اشک کے ٹپکا دو حلق میں

۵۳۔

سوئے ہوئے ہو دیر سے اکبرؑ بس اب اٹھو
کیا کہہ رہا ہے یہ پدرِ پیر۔ سُن تو لو
سُن لوں صدا تمہاری تو دل کو سکون ہو
ہنگامِ عصر آ گیا اُٹھ کر اذان دو
اب تک ہے یاد وقتِ سحر کی اذان کی
اک بار پھر سُنا دو صدا نانا جان کی

۵۴۔

کرتے تھے شاہ بیٹے کی میّت سے یہ کلام
ناگاہ چار سمت سے اُمڈی سپاہِ شام
چلنے لگے خدنگ و تبر۔ نیزۂ و حسام
پشتِ فرس سے پشتِ زمیں پر گرے امامؑ
ساہی کی شکل تن تھا سراسر حسینؑ کا
تیروں پہ دیر تک رہا پیکر حسینؑ کا

۵۵۔

طاقت نہیں کہ خامہ لکھے اب بیانِ غم
کیونکر ملا زمیں سے تنِ سرورِ اُمم
حالت یہ تھی کہ ہوتے تھے گہ راست گاہ خم
جھکتے تھے بہرِ سجدہ سوئے خاک دمبدم
آفت اک آئی تا بہ زمیں، منہ کے بل گئے
جتنے تھے تیر پشت کی جانب نکل گئے

☆☆☆☆☆

maablib.org

# اے فکرِ جواں! صفحۂ دانش پہ رقم ہوں

## (ہدایت)

۱۔

اے فکرِ جواں! صفحۂ دانش پہ رقم ہو
اے فرقِ گماں! علم کی دہلیز پہ خم ہو
اے خامۂ جاں! دشتِ معانی میں علم ہو
اے طبعِ رواں! زیب دہ نون و قلم ہو
تحریر کے قبضے میں ہو خشکی بھی تری بھی　　　ہو معترفِ زورِ قلم، دیدہ وری بھی

۲۔

اے ذوقِ سخن، بامِ فصاحت سے عیاں ہو
اے حرفِ حسن، شہرِ سماعت میں اذاں ہو
اے طرزِ کہن، کاوشِ جدت سے جواں ہو
اے دجلۂ فن، کوہِ طلاقت سے رواں ہو
شعروں میں سمندر کی روانی نظر آئے　　　ہر لفظ میں دانش کی کہانی نظر آئے

۳۔

میں کیسے کہوں اپنی ہی دانش کی کہانی
باسطوتِ افکار و بہ ایں جوشِ معانی
زیبا نہیں خود اپنی زباں سے ہمہ دانی
غالب سے لئے وام کئی مصرعِ ثانی
تب جا کے تعلّی کے لئے لفظ ملے ہیں　　　یوں چاک مری فطرتِ جاہل کے سلے ہیں

۔۴۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
جز وہم، نہیں ہستئ اشیاء مرے آگے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے — جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

۔۵۔

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور
ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

۔۶۔

عادت نہیں مری یہ تعلّی یہ ترفع
مقصد تھا بس اب فن کے بزرگوں کا تتبع
یہ فخر ہے کیا کم کہ ہوں داتائے تشیع
ہے اہلِ سماعت سے تسامح کی توقع
حیراں نہ ہوں، شعروں میں اگر جان نہیں ہے — یہ شوق ہے میرا، مری پہچان نہیں ہے

۔۷۔

کیا بزم کی خواہش ہے یہ پہچان رہا ہوں
میں ذوقِ سماعت کی طلب جان رہا ہوں
دامانِ خیالات کو گردان رہا ہوں
اب خاک سے درہائے نجف چھان رہا ہوں
کاغذ پہ ہویدا ہوں وہ نقشے چم وخم کے — ہوں ارض وسماوات بھی قبضے میں قلم کے

۸۔

یہ ارض و سماوات نرا ویران حویلی
انساں اسی ویران حویلی کی پہیلی
انسان، کہ جس کا نہ کوئی یار نہ بیلی
بوجھے نہ فرشتے بھی، وہ دشوار پہیلی
اسماء و معانی کے گہر رول رہا تھا    آفاق تھے خاموش، بشر بول رہا تھا

۹۔

انسان کی تاریخ کا وہ عہدِ اوائل
جب گردنِ انساں میں تھا تعویذ حمائل
آغازِ تعقّل کے وہ نو عمر دلائل
محدود تھے جن میں کسی بستی کے مسائل
انساں کے فضائل کی شفق پھول رہی تھی    تاریخ کے جھولے میں زمیں جھول رہی تھی

۱۰۔

تاریخ کا آغاز، وہ غاروں کے اندھیرے
غاروں کے اندھیروں میں وہ انسانوں کے ڈیرے
ڈیروں پہ وہ فرسودہ روایات کے گھیرے
گھیروں کی حسیں سطح پہ پنگھٹ کے سویرے
پنگھٹ کے سویروں میں فضا جھوم رہی تھی    اک محورِ تازہ پہ زمیں گھوم رہی تھی

۱۱۔

آغوشِ خطابت میں پلی شعلہ بیانی
جذبات کے سانچوں میں ڈھلی دل کی کہانی
کھیتوں کے منڈیروں پہ اُگی زمزمہ خوانی
ادراک و تعقّل پہ امنڈ آئی جوانی
یوں وہم و گماں جذب ہوئے علم و یقیں میں    تہذیب سنورنے لگی آغوشِ زمیں میں

۱۲۔

پروان چڑھے علم بھی، صنعت بھی، ہنر بھی
پیدا ہوئے دیندار بھی ارباب نظر بھی
تہذیب کی تدوین میں سینے بھی تھے سر بھی
تعمیر کی تزئین، حکایات سفر بھی
انسان نے صدیوں کی وراثت کو سمیٹا        بکھری ہوئی ہر ایک حکایت کو سمیٹا

۱۳۔

لعل لب شیریں کے تبسم کی حکایت
سرمایہ و محنت کے تصادم کی حکایت
ہر فکرِ مجرد کے تجسم کی حکایت
قطرے کی حکایت کبھی قلزم کی حکایت
ساحل کی ہوائیں بھی، نسیم سحری بھی        فہرستِ حکایات میں جن بھی تھا پری بھی

۱۴۔

فہرستِ حکایات میں انسان بھی جن بھی
بوڑھے کا بڑھاپا بھی جواں سال کا سن بھی
بھیگی ہوئی راتیں بھی، مہکتے ہوئے دن بھی
اقوام کی تاریخ، جو آساں بھی کٹھن بھی
رہوار کی مہمیز بھی تلوار کی زد بھی        مرمر کے محلات بھی مٹی کی لحد بھی

۱۵۔

بھادوں کی کڑی دھوپ بھی، ساون کی جھڑی بھی
قربت کی حسیں رات بھی، فرقت کی گھڑی بھی
پتھر کی عمارات بھی، موتی کی لڑی بھی
لوہے سے بنا گرز بھی، پھولوں کی چھڑی بھی
تہذیب کا طومارا اٹھائے ہوئے سر پر        یوں قافلۂ زیست چلا اپنے سفر پر

-۱۶-

آغاز سے اس قافلۂ زیست کے ہمراہ
کچھ لوگ تھے انساں کی سعادت کے بھی خواہ
حساس و خدا ترس و بشر فہم و خود آگاہ
ان لوگوں میں ہر ایک تھا منصوص من اللہ
پہرہ تھا مشیت کا ہر اک گام پہ ان کے          عصمت کی قبا چست تھی اندام پہ ان کے

-۱۷-

ہر دور میں ہر قوم میں آتے رہے یہ لوگ
تہذیب کی راہوں کو سجاتے رہے یہ لوگ
پتھر پہ گلابوں کو اُگاتے رہے یہ لوگ
خالق کا یہ پیغام سناتے رہے یہ لوگ
یوں قافلۂ زیست سوئے عرش رواں ہو          دوشِ بشریت پہ سعادت کا نشاں ہو

-۱۸-

یہ لوگ، کہ تھے حاملِ احکامِ الٰہی
توحید کی سرحد کے اولو العزم سپاہی
عصمت کدۂ جاں میں لئے دین پناہی
دیتے رہے اللہ کی وحدت کی گواہی
کھولے ہوئے توحیدِ الٰہی کے علَم کو          اک مرکزِ واحد پہ سمیٹے تھے اُمم کو

-۱۹-

یہ خاتمِ تقدیسِ نبوت کے نگینے
سینوں میں لئے لطفِ الٰہی کے خزینے
کھیتے رہے خالق کی مشیت کے سفینے
بستے رہے دنیا میں ہدایت کے مدینے
کھٹکا تھا نہ رہزن کا نہ بیدادگروں کا          ہر موڑ پہ پہرہ تھا انہی راہبروں کا

۲۰۔

یہ وارثِ ذہن حاملِ اقدار و نوامیس
کرتے رہے اخلاق و قوانین کی تدریس
جڑتی رہی ہر دور میں اذہان کی تاسیس
بیٹھا تھا مگر تاک میں انسان کی، ابلیس
نیکی کی روایات کو حل کر کے بدی میں
ذہنوں کو بدلتا رہا ہر ایک صدی میں

۲۱۔

پیدا ہوئے تہذیب کی راہوں میں جو کھانچے
توڑے گئے آباء کی روایات کے سانچے
بوئے گئے اجسام، اُگائے گئے ڈھانچے
مارے گئے تہذیب کے چہرے پہ طمانچے
دنیا میں جو یہ معرکۂ نسل و زباں ہے
تہذیب کے چہرے پہ طمانچوں کا نشاں ہے

۲۲۔

جب سلسلۂ فکرِ بشر ٹوٹ چکا ہو
جب بے ہنری خود ہی زرِ بیش بہا ہو
جب بے بصری مایۂ ہر دیدۂ وا ہو
جب طفل ہی میراثِ اب و جد سے خفا ہو
کیا اس کو سر و برگِ تمنا نظر آئے
جب چار طرف ریت کا صحرا نظر آئے

۲۳۔

وہ طفل کہ جس طفل کی تقدیر بگڑ جائے
دورانِ سفر اپنے بزرگوں سے بچھڑ جائے
وہ پیڑ جو آندھی کے سبب جڑ سے اکھڑ جائے
جھنجھلایا ہوا ذہن ہے ہر ایک سے لڑ جائے
کیا اس کو تعلق ہو محبت کی فضا سے
جو خود سے ہو ناراض وہ لڑتا ہے ہوا سے

۔۴۴

اور اس کے مقابل یہ خداوند کی رحمت
انسان کو دنیا میں ہے جس چیز کی حاجت
پہلے سے مہیا ہے بہ مقدارِ ضرورت
ادنیٰ سی توجہ سے ہویدا ہے یہ حکمت
بخشا گیا پہلے تو وجود آبِ رواں کو پھر دی گئی پانی کی طلب جسم و زباں کو

۔۴۵

یہ رحمتِ مطلق ہے حکیم دوسرا کی
ہے سانس کا محتاج جو یہ پیکرِ خاکی
خلقت ہوئی حاجت سے بہت قبل ہوا کی
تب پیکرِ انسان کو تخلیق عطا کی
یوں سہل کیا نظمِ تنفس کے سفر کو محسوس ہوا ہی نہ کبھی جنس بشر کو

۔۴۶

جوہر طلب جسم کو کرتا ہو سرافراز
وہ روح کی حاجت کو کرے کیوں نظر انداز
دی قدرتِ خلاق نے کونین کو آواز
اس عالمِ امکاں کا ہدایت سے ہو آغاز
آدم کو خلافت ہو عطا بخششِ رب سے ہو راہ نما قبل ہدایت کی طلب سے

۔۴۷

اس سلسلۂ رشد و ہدایت کے جلو میں
اسلام کی تابندہ روایات کی ضو میں
چلتی رہیں بتلائی ہوئی راہ پہ قومیں
کچھ لوگ مگر بہتے رہے کفر کی رو میں
کرتوں میں جہالت کا دھواں گھول رہا تھا ابلیس ہر اک ذہن میں پر تول رہا تھا

۲۸۔

جب تیرگیاں دامنِ انوار کو تھامیں
صبحوں پہ برس جائیں سیہ رات کی شامیں
ہوتا ہے نمودار پھر اِک ہاتھ فضا میں
قبضے میں لیے نفس کے گھوڑوں کی لگامیں
جو خوئے بد آموز کی مہمیز کو روکے ہر نفس کے بگڑے ہوئے شبدیز کو روکے

۲۹۔

افکار و خیالات کی سوکھی ہوئی جھیلیں
ٹوٹی ہوئی راہوں کی درایت کی سبیلیں
چٹخی ہوئی فرسودہ تمدن کی فصیلیں
پہلو میں روایات کے، بوسیدہ دلیلیں
وہ شخص ہے اس صورتِ حالات کو بدلے جو حق سے اولوالعزم رسالت کی سند لے

۳۰۔

جو وہم و خرافات کی بستی کو اُجاڑے
ملبوسِ روایات سے عصیان کو جھاڑے
بڑھتے ہوئے ملعون درختوں کو اکھاڑے
اک تازہ شریعت کا علم دہر میں گاڑے
ابلاغِ شریعت پہ معین جو نبی ہو قرآن کے لفظوں میں اولوالعزم وہی ہو

۳۱۔

وہ دشتِ عرب یعنی درندوں کی وہ بستی
تھی زیست جہاں جنسِ گراں، موت تھی سستی
رقصاں تھی ہر اک گام پہ اصنام پرستی
کیونکر نہ گھٹا اس پہ ہدایت کی برستی
یہ ابرِ ہدایت ابھی پر تول رہا تھا کردار سے ذہنوں کی گرہ کھول رہا تھا

۳۲۔

آخر افق جاں پہ ہوا نور کا تڑکا
پھر ابرِ کرم فرقِ روایات پہ کڑکا
پھر قلبِ بشر شدتِ احساس پہ دھڑکا
بجھنے کے لئے شر کا چراغ اور بھی بھڑکا
ذرّوں میں چمک آئی شریعت کی ضیا سے  سورج نکل آیا افقِ غارِ حرا سے

۳۳۔

جبریلؑ ہوئے خم پئے تسلیمِ غلامی
تعظیم بجا لائے رُسولانِ گرامی
انفس میں مچلنے لگی بیدار خرامی
آفاق نے دی دینِ محمدؐ کو سلامی
اس شخص نے یوں پرورشِ فکرِ بشر کی  ٹیلوں نے فلک بوس فصیلوں پہ نظر کی

۳۴۔

تشکیک کے ہر موڑ سے اذہان کو موڑا
جو بت تھے گمانوں کے انہیں علم سے توڑا
ٹوٹے ہوئے تہذیب کے ہر تار کو جوڑا
جذبوں کو کھنگالا، کبھی فکروں کو نچوڑا
ایقان کی تہ جمنے لگی سطحِ گماں پہ  کردار سے صیقل ہوئی آئینۂ جاں پہ

۳۵۔

ظاہر ہوئے ہر رنگ میں آثارِ نبوت
لیکن تھی دلوں کو ابھی ایقاں کی ضرورت
چل کر شجر آیا پئے تصدیقِ رسالت
یوں ذہن سے کھرچی گئی ظلمت کی کثافت
ہمت شکن اعجاز نے بے جان کو جاں دی  پتھر نے محمدؐ کی ہتھیلی پہ اذاں دی

۳۶۔

تکوین کی معراج، خدوخالِ محمدؐ
تشریع کے سرتاج ہیں اعمالِ محمدؐ
ہے کاہ کشاں سایۂ اقبالِ محمدؐ
اور نفسِ محمدؐ بخدا آلِ محمدؐ
یہ لوگ جو رہتے نظر آتے ہیں گھروں میں
کونین کو ڈھانپے ہوئے بیٹھے ہیں پردوں میں

۳۷۔

وہ گھر کہ جو ہیں رحمتِ باریؑ کے مظاہر
کعبے کی طرح ان کی فضائیں بھی ہیں طاہر
مٹی کے وہ آنگن ہیں صد رشکِ جواہر
اور وحدتِ انوار سے ہے صاف یہ ظاہر
بکھرے جو نظر آتے ہیں یہ وہمِ نظر ہے
کُل آلِ محمدؐ کا فقط ایک ہی گھر ہے

۳۸۔

وہ گھر کہ جو تیار ہوا حکمِ صمد پر
وہ گھر کہ جو تعمیر ہوا پشتِ ابد پر
وہ گھر کہ جو استادہ ہے بنیادِ خرد پر
وہ گھر کہ جو قائم ھو اللہ احد پر
توحید کا اعلان اُسی گھر کا ہدف ہے
اس گھر کی غلامی ہی مرا عز و شرف ہے

۳۹۔

یہ گھر کہ جو تکوین کے پھولوں کا چمن ہے
یہ گھر کہ جو صورت دہِ کہسار و دمن ہے
اس گھر کا ہر اک فرد فضائل کا وطن ہے
آغاز میں آغوشِ محمدؐ میں حسنؑ ہے
انجام میں آغوشِ حسنؑ میں ہے محمدؐ
اس گھر کا ہر اک اپنے چلن میں ہے محمدؐ

۴۰۔

جرأت اسی گھر میں ہے شجاعت اسی گھر میں
سطوت اسی گھر میں ہے، شہامت اسی گھر میں
تقویٰ اسی گھر میں ہے، طہارت اسی گھر میں
لایا ہے ملک امرِ نبوت اسی گھر میں
آغاز ہوا کارِ رسالت اسی گھر سے
نکلی ہے زمانے میں شریعت اسی گھر سے

۴۱۔

کہتے ہیں شریعت جسے اربابِ دیانت
ہے روحِ تمدن کے تحفظ کی ضمانت
جو اٹھ نہ سکی ارض و سما سے وہ امانت
کاندھوں پہ لئے ہے اسے انساں کی متانت
یہ حق کی ہدایت کا تسلسل ہے زمیں پر
یہ صبح کا تارا ہے رسولوں کی جبیں پر

۴۲۔

زخمِ دلِ ابلیس تھی یہ خیر کی تحریک
بل کھا کے سوئے نور بڑھی ظلمتِ تشکیک
روشن تھا جو ماحول وہ ہونے لگا تاریک
تہذیب کی گردن پہ چلا خنجرِ تضحیک
انوار ہیں ظلمات کے آسیب کی زد پر
آوارگیٔ فکر کا حملہ ہے خرد پر

۴۳۔

پھر گلشنِ اسلام میں ہونے لگا پت جھڑ
غنچوں کے شبستانوں میں چلنے لگے جھکڑ
بستی کو شریعت کی بنایا گیا بیہڑ
تاریخِ فقاہت میں اٹھے لال بھبھوکو
قانون کی گاڑی کو غلط کھینچنے والے
قرآن پہ تنسیخ کا خط کھینچنے والے

۴۴۔

افلاک کے رفعت میں زمیں تاکنے والے
دھول اپنی جہالت کی سدا پھانکنے والے
لوگوں کے دلوں میں عمداً جھانکنے والے
بد مست حماروں کا جتھا ہانکنے والے
جبریل کے مولا پہ زباں کھول رہے ہیں منہ زور، مویشی کی طرح بول رہے ہیں

۴۵۔

ہونٹوں پہ ہیں ایمان کے دعووں کے ترانے
ہیں وردِ زباں عظمتِ احمدؐ کے فسانے
آواز مگر دی جو کبھی دینِ خدا نے
کانوں کو کیا بند، لگے آنکھ چرانے
ان شیروں کو میداں میں اترتے نہیں دیکھا تیغوں میں کسی سر کو ابھرتے نہیں دیکھا

۴۶۔

ایماں کو ہے پھر حیدرِؑ صفدر کی ضرورت
پھر کفر کے نرغے میں ہیں احکامِ شریعت
دیتی ہے صدا دینِ پیمبرؐ کی وراثت
اے وارثِ شمشیرِ علیؑ پھر وہی ضربت
ہاں تیغِ دو پیکر کو اٹھا، دیں کی دُعا لے تو زوجِ شریعت ہے، شریعت کو بچا لے

۴۷۔

تو وادیِ تقدیس کا اک سروِ خراماں
تو شاہِ ازل، جاہِ ابد، ماہِ رسولاں
تو عزمِ خدا، جزمِ نبیؐ، رزمِ شہیداں
تو سِرِّ جہاں، سدرۂ جاں، سطوتِ امکاں
ملتا ہے یہ نکتہ ہمیں ادراکِ فزوں سے تو ربطِ مسلسل ہے شہا، کاف کانوں سے

۴۸۔

تو قطبِ زمیں، سپہرِ زماں، سایۂ طوبیٰ
تو نورِ خدا، طورِ خرد، مرضیِ موٹی
تو شمس و قمر، نون و قلم، کوثر و طٰہٰ
تو تابہ ابد دہر کا وہ ناظمِ تنہا
جو توڑ کے بیٹھا ہے فسوں شام وسحر کے    چٹکی میں دبائے ہے ورق شمس و قمر کے

۴۹۔

شمسِ ملکوت و قمرِ برجِ مشیت
خضرِ خرد و یوسفِ گم گشتۂ حکمت
مولائے وجودات و شہِ کشورِ قدرت
دارائے قضا و دُرِ ملکِ اَبدیّت
احکامِ سرِ عرش، ترے زیرِ نگیں ہیں    اجداد ترے دوشِ محمدؐ کے مکیں ہیں

۵۰۔

میرِ خس و خاشاک و امیرِ گل و ریحاں
تاجِ سرِ ایقاں و خراجِ رہِ عرفاں
دردِ دلِ مظلوم و درودِ لبِ انساں
خالِ رُخِ توحید و خیالِ خوشِ یزداں
ہر شے کا ہے جس ذات میں احصا وہ مبیں ہے    تو ختمِ امامت کی انگوٹھی کا نگیں ہے

۵۱۔

ہٹ کر ترے اقوال سے ہر قول ہے یا وہ
اوہام کے ناقے پہ جہالت کا کجاوہ
میدانِ جدل میں فریبِ عقل کا کاوہ
ہر شے ہے یہاں حرفِ غلط، تیرے علاوہ
تو لشکرِ گیتی ہے پناہ دل و جاں ہے    آفاق کی مسجد میں محمدؐ کی اذاں ہے

۵۲۔

رنگِ رُخِ تہذیب و خدنگِ سرِ جنگاہ
آوازِ لبِ مفلس و ایمائے شہنشاہ
رمزِ خلشِ رُوح و رموزِ تپشِ راہ
صحرا و بیابان و دلِ کوہ و پرِکاہ
برگشتہ ہیں سب حیّ علیٰ خیر عمل سے     اِک میں ہوں کہ بیٹھا ہوں ترے در پہ ازل سے

۵۳۔

چلتی ہیں زمانے میں پُر آشوب ہوائیں
بھٹکی ہوئی پھرتی ہیں خلاؤں میں دعائیں
گلیوں سے ابھرتی ہیں درندوں کی صدائیں
بھونچال کا عالم ہے کہاں بھاگ کے جائیں
ہر دم غمِ تازہ سے ملاقات ہے مولا     حاکم یہاں منجملۂ آفات ہے مولا

۵۴۔

جب تشنگیِ جہل سے سوکھی ہوں زبانیں
ساکت ہوں ہر اک غیرتِ ناہید کی تانیں
ٹوٹی ہوئی بکھری ہوں تعقل کی کمانیں
ہم فکر کو پھینکیں کہ روایات کو چھانیں
جو دشت میں تہذیب کا گھر ڈھونڈ رہے ہیں     وہ شاخِ بریدہ پہ ثمر ڈھونڈ رہے ہیں

۵۵۔

گم گشتہ بشر نقدِ روایات کو کھو کے
کس طرح زمانے کو غلط بات پہ ٹوکے
کس طرح خود اپنے کو کوئی ظلم سے روکے
دوزخ کی طرف وا ہیں ہر اک گھر کے جھروکے
ایمان پہ الحاد کی برسات ہے مولا     اِک چشمِ کرم ہو تو بڑی بات ہے مولا

۔۵۶۔

میں اک خسِ بے مایہ تو گلزار مجسم
میں زخمِ سراپا، تو مرے زخم کا مرہم
میں ارضِ اطاعت، تو مری ارض کا آدم
میں اک متشابِہ تیری ذات آیۂ محکم
بندہ نہ بنا میں کبھی حکامِ نجس کا    والعصر کے صدقے میں صلہ دے مجھے اس کا

۔۵۷۔

جب تک کہ بقا ہو قلم و لوح و جناں میں
باقی رہے جب تک کہ چمک کاہ کشاں میں
ہر بندۂ مومن ہو ترے حفظ و اماں میں
سب فائز و مامون رہیں ہر دو جہاں میں
ہر حاضر و سامع ہو بری رنج و محن سے    میں اور مرا کنبہ بھی رہے دور فتن سے

۔۵۸۔

اے تو کہ ہے صدیوں سے دل غیب میں ساکن
اللہ بہت جلد دکھائے ہمیں وہ دن
جب تو، ہو سرِ عرشِ حکومت متمکن
لاریب کہ یہ زیست اک آزار ہے تجھ بن
سرگشتۂ صحرا و بیاباں تیرے صدقے    قربان مرا باپ مری ماں تیری صدقے

۔۵۹۔

بس یہ ہے مرے کلکِ عقیدت کی نگارش
ان تشنہ لب آنکھوں پہ ہو دیدار کی بارش
دستک ہے ترے بابِ کرم پر یہ گذارش
لایا ہوں ترے پاس ترے جد کی سفارش
مایوس نہیں میں شبِ تیرہ کی سحر سے    بس اتنا الم ہے کہ تو غائب ہے نظر سے

۔۶۰۔

پھر یہ بھی یقیں ہے کہ نظر سے تری غیبت
ہے اپنی جگہ خود ترے جینے کی ضمانت
جب تک متصادم نہ ہو شر کی کوئی قوت
تو زندہ رہے گا یہ ہے معصوم کی فطرت
حاکم ہے تو اسباب کا محکوم نہیں ہے      دب جائے جو فطرت سے وہ معصوم نہیں ہے

۔۶۱۔

کیا مصلحتِ غیب ہے اللہ ہی جانے
دنیا مگر اس غیب سے بُنتی ہے فسانے
سمجھا ہے اسے واہمہ اربابِ خطا نے
انکار کے مل جاتے ہیں لوگوں کو بہانے
کیسے انہیں سمجھائیں کہ یہ نقصِ یقیں ہے      غیب ایک حقیقت ہے یہ افسانہ نہیں ہے

۔۶۲۔

ہر ذائقہ ہے لمس کی قوت کے لئے غیب
ہر شامہ ہے اکل کی لذت کے لئے غیب
ہر منظرِ دلکش ہے سماعت کے لئے غیب
آواز کا ہر رُخ ہے بصارت کے لئے غیب
دیکھی ہے کبھی اپنی بقا چشمِ ہنر سے      سانسوں کا تسلسل بھی تو غائب ہے نظر سے

۔۶۳۔

دنیا کے لئے غیب ہے اللہ کی وحدت
اک غیب ہے ماضی میں جو جاری تھی نبوت
اب غیب ہے کہتے ہیں جسے روزِ قیامت
قائم انہی غیبوں پہ ہے مذہب کی حقیقت
ہر غیب پہ ایماں ہے اک غیب سے کد ہے      کچھ قولِ پیمبرؐ سے عداوت کی بھی حد ہے

۶۴۔

اب کون انہیں سمجھائے کہ اے خام تگاہو!
کیا بس وہی مانگو گے جسے دیکھ لیا ہے
معدوم ہے ہر شے جو بصارت سے ورا ہو
یہ کلیہ مانا تو ذرا سوچ لو کیا ہو
دیکھی ہے کہیں روح جسے مان رہے ہو        کیا عقل کو دیکھا ہے جو پہچان رہے ہو

۶۵۔

کہتے ہیں کہ غائب کی ہدایت کا ثمر کیا
جو دائرہ حس میں نہ ہو اس کا اثر کیا
اک منزلِ موہوم پہ ہو عزمِ بشر کیا
اک جادۂ نادیدہ سے جنت کا سفر کیا
غائب کے لئے اُن کی ہر اک بات بجا ہو        گر آنکھ سے جنت کو کہیں دیکھ لیا ہو

۶۶۔

عرفانِ تعقل سے تہی مغز ہے جن کا
کرتے ہیں قیاس آج بھی وہ رات پہ دن کا
کہتے ہیں کہ کیا راز ہے اس شخص کے سن کا
ہو جیسے بڑی بات کوئی سانس کا گنا
جس شخص کی مٹھی میں خزانہ ہو ابد کا        محتاج ہو وہ سانس کے تنکوں کی مدد کا

۶۷۔

وہ دشتِ بلا اور وہ شبیرؑ کی پیکار
راکب کے اشارے پہ وہ اڑتا ہوا رہوار
میداں میں وہ حیدرؑ کے جگر بند کی للکار
گرتی ہوئی، فوجوں پہ وہ شمشیر شرر بار
وہ حرب کے اڑتے ہیں دغا بازوں کے سر بھی        وہ ضرب کہ کٹتا ہے کلیجہ بھی، جگر بھی

۔۶۸۔

عصمت کو کبھی جاں سے گزرتے نہیں دیکھا
ڈرتی ہے اجل خود، اُسے ڈرتے نہیں دیکھا
معصوموں کے جسموں کو بکھرتے نہیں دیکھا
مارے گئے یہ لوگ اِنہیں مرتے نہیں دیکھا
مرتے نہیں، سینے سے لگاتے ہیں شہادت　　یہ زہر سے یا تیغ سے پاتے ہیں شہادت

۔۶۹۔

تاریخ کے سینے میں ہیں محفوظ وہ منظر
جب ضربتِ شمشیر سے زخمی ہوئے حیدرؑ
جب زہرِ ہلاہل سے کٹا تھا دلِ شبرؑ
پھر کرب و بلا اور شہِ مظلوم کے تیور
کیا رُکتے حسینؑ ابنِ علیؑ فوجِ دغا سے　　لیکن نہ بڑھا کوئی قدم حق کی رضا سے

۔۷۰۔

بھگدڑ میں زمانے ہیں لرزتی ہیں زمینیں
گرتے ہوئے گھوڑے ہیں ڈھلکتی ہوئی زینیں
دہشت کے پسینے سے ہیں آلودہ جبینیں
ناگوں کے تعاقب میں چلیں موت کی بینیں
حاصل ہے نہ اب امن دنی کو نہ ولی کو　　بھولے ہیں شجاعانِ عرب جنگِ علیؑ کو

۔۷۱۔

ایسے ہیں اک آواز حسینؑ ابنِ علیؑ بس
اب وقتِ شہادت ہے قریں میرے ولی بس
استادہ ہیں پہلو میں نبیؐ ازلی بس
سر کھولے کھڑی ہے تری ماں کوکھ جلی بس
تا دور ملائک پئے تکریم کھڑے ہیں　　یہ حیدرؑ صفدر، وہ براہیمؑ کھڑے ہیں

۷۲۔

شہ نے کیا رہوار کو رکنے کا اشارہ
پھر ڈاب میں تلوار کو رکھ کر یہ پکارا
او بد نسبو! ختم ہوا کام ہمارا
بھاگی ہوئی افواج پلٹ آئیں دوبارہ
حملہ کیا فوجوں نے جو مل کر شہِ دیں پر
چھوڑا ئے سرِ پاک کو بیٹھے رہے زیں پر

۷۳۔

تولے ہوئے تلواروں کو بڑھ آئے رسالے
لپکے شہِ والا کی طرف خنجروں والے
ہر سمت سے مظلوم پہ چلنے لگے بھالے
کس طرح فرس اپنی سواری کو سنبھالے
حلقوم و سر و سینہ و رُخسار بھی زخمی
زخمی مرا مولا بھی ہے رہوار بھی زخمی

۷۴۔

اک سیدِ مظلوم ہے اور سینکڑوں بے پیر
اک شخص ہے اور سینکڑوں ہاتھوں میں ہے شمشیر
گہ سنگ برستے ہیں تو آتے ہیں کبھی تیر
لگتا ہے کبھی گرز تو جھک جاتے ہیں شبیرؑ
ایسے میں کسی غم زدہ بی بی کے یہ نالے
اے کُل کے محافظ مرے بچے کو بچا لے

۷۵۔

گھوڑے سے سوئے فرش چلے سیدِ والا
رہوار نے گھٹنوں کے بل آقا کو سنبھالا
جبریلؑ نے قدموں سے رکابوں کو نکالا
پہنچے جو زمیں پر تو زمیں تھی تہ و بالا
اک شور تھا گریہ کا بپا جن و ملک میں
سورج کو گہن تھا تو سیاہی تھی فلک میں

۔۷۶۔

جیسے ہی زمیں پہ شہِ جن و بشر آئے
سینے پہ جو تھے تیر کلیجے میں در آئے
کیا ایسے میں ماں کی کوئی امید بر آئے
قطرے تھے لہو کے کہ جو آنکھوں میں بھر آئے
سر بیٹے کا زانو پہ رکھا، عرش پہ دیکھا بہتے ہوئے پھر بیٹے کا خوں فرش پہ دیکھا

۔۷۷۔

جب بیٹے کا سر کٹتا تھا آغوش میں ماں کی
کیا حال تھا زہراؑ کا نہیں تاب بیاں کی
کچھ لمحوں میں گردن سرِ اقدس سے جدا تھی
ہر سانس تھی اک موجِ لقا شاہِ زماں کی
سجدہ میں رکھا سر کہ یہی عین رضا تھی کچھ لمحوں میں گردن سرِ اقدس سے جدا تھی

۔۷۸۔

جب طبلِ ظفر فوج نے میداں میں بجایا
اک بی بی نے بیمار بھتیجے کو جگایا
عابدؑ نے جونہی خیمے کے پردے کو اٹھایا
اک سر انہیں نیزے کی انی پہ نظر آیا
بیساختہ بستر سے اُٹھے سیدِ سجادؑ تسلیم امامت کو جھکے سیدِ سجادؑ

۔۷۹۔

شبیرؑ کی ماں کو تو زمانے نے نہ دیکھا
لیکن تھا عیاں سب پہ جو عالم تھا بہن کا
سو بار اٹھا، اٹھ کے گرا خیمے کا پردا
لیکن سرِ شبیرؑ جونہی نیزے پہ آیا
اس وقت نہ زینبؑ کو کسی طرح کل آئی سر کھولے ہوئے خیمے سے باہر نکل آئی

۸۰۔

بولی کہ میں ہوں احمدؐ مختار کی بیٹی
سن لو میں ہوں خیبر کے علمدارؑ کی بیٹی
رک جاؤ، کہ ہوں گُل کے مددگار کی بیٹی
ہٹ جاؤ کہ ہوں، حیدرؑ کرار کی بیٹی
اندھیرا ہے ایسا، کہ زمیں رن کی نہاں ہے　　لوگو! مجھے بتلاؤ مرا بھائی کہاں ہے

۸۱۔

سفاک تنوں، گرگ خصالوں کو ہٹایا
سیافوں کو اور برچھیوں والوں کو ہٹایا
سنگ افگنوں کو، تیغوں کو ڈھالوں کو ہٹایا
یہ کہہ کے خوزادی نے رسالوں کو ہٹایا
رستہ مجھے دے دو کہ نواسی ہوں نبیؐ کی　　عباسؑ کی خواہر ہوں، تو بیٹی ہوں علیؑ کی

۸۲۔

اک سنگ کے تودے کے تلے لاش کو دیکھا
پھر پتھروں کو شاہؑ کے لاشے سے ہٹایا
رو کر کہا، یہ ہے مرے ماںجائے کا لاشا؟
اک بار جھکیں، ہاتھوں پہ لاشے کو اٹھایا
بولیں 'مرے رب ہدیہ ہے یہ حق کے ولی کا　　یہ آخری فدیہ ہو قبول آلِ نبیؐ کا'

۸۳۔

اے طالبؔ خستہ جگر و سوختہ ساماں
کر عرض ادب سے کہ مرے رب مرے یزداں
مقبولِ مشیت ہوں یہ اشعار پریشاں
ہو سر پہ مرے سایۂ دامانِ شہیداں
لکھے آخری بند اپنی غلامی کے نسب میں　　مصرعے ہوں سلامی کے، مگر حدِ ادب میں

۸:۔

نیزے کی بلندی پہ کٹے سر کو سلامی
کانوں سے اتارے ہوئے گوہر کو سلامی
شہزادیٔ کونین کی چادر کو سلامی
سجادؑ کے جلتے ہوئے بستر کو سلامی
اے صاحب عصرؑ! آمر دوراں تجھے تسلیم — اے منتقم خون شہیداں تجھے تسلیم

☆☆☆☆☆

maablib.org

کتاب۔ انجم

شاعر۔ علامہ نجم آفندی

سنِ اشاعت: ۱۹۷۷

# حجۃ الاسلام

# علامہ طالب جوہری

قرآن مجید نے سورۂ شعراء میں شاعروں پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ شاعر بے مقصد ہر وادی میں گھومتے ہیں اور اُن کے قول و عمل میں تضاد ہوتا ہے۔ پھر اُن شاعروں کو مستثنیٰ کیا جو مومن ہیں اعمالِ صالح انجام دیتے ہیں۔ ذکرِ خدا میں مشغول رہتے ہیں اور انتصار مظلوم کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ حضرت نجم آفندی مرحوم انہی مستثنیٰ شاعروں میں سے ہیں۔ جنہوں نے اپنے فکر و فن کی ساری صلاحیتوں کو ذکرِ محمدؐ و آلِ محمدؐ کے لئے وقف کر دیا۔

میری ذاتی رائے کے مطابق حضرت نجم آفندی نصف صدی تک اردو کے رثائی ادب پر حکومت کرتے رہے اور نسلِ نو کا کوئی ایسا مرثیہ نگار نہیں ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اُن سے متاثر نہ ہوا ہو۔ اگرچہ مرحوم نے بہت کم مرثیے لکھے اور زیادہ توجہ نوحوں اور نظموں پر فرمائی لیکن یہ اصنافِ سُخن شعری جدید قدروں سے اس درجہ ہم آہنگ تھیں کہ وہ جدید قومی و دینی شاعری پر اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ صدیوں پرانی کہاوت ہے کہ ستارے کا ٹوٹنا کسی بڑے آدمی کی موت کا اشارہ ہوتا ہے۔ نجم آفندی آسمانِ ادب سے ٹوٹ کر اشکِ عزا کی طرح زمین کے رومال میں جذب ہوگئے اور سُننے میں یہ آیا کہ اُن کی تشیع جنازہ میں معدودے چند لوگوں نے شرکت کی یہ اشارہ تھا اس بات کا کہ قوم مرچکی ہے اور مُردوں سے کسی کو کوئی شکایت نہیں ہوتی۔

والسلام

طالب جوہری

کتاب۔ مراثیِ فیض

شاعر۔ فیض بھرت پوری

سنِ اشاعت: ۱۹۷۹

# ”فیض کی مرثیہ نگاری کا تجزیہ“

## حجۃ الاسلام علامہ طالب جوہری

مراثیِ فیض کے از سرِ نو مطالعہ سے کچھ دن قبل میں نے سید آلِ رضا مرحوم کی مجلس ایصالِ ثواب سے خطاب کرتے ہوئے سورۂ شعراء کی آخری آیت کی روشنی میں شاعر کے لئے چار شرائط کا تذکرہ کیا تھا۔ ایمان، عملِ صالح، بکثرت ذکرِ خدا اور نصرتِ مظلوم ۔۔۔ اردو کے تمام اصناف میں مرثیہ وہ واحد صنف ہے جو ان تمام شرائط کو بیک وقت پورا کرتا ہے اس سے بڑھ کر اس صنف کی جلالت اور افادیت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔۔۔ اور یقیناً یہ تائیدِ ایزدی ہے جس کے سبب یہ صنف اس قدر محتشم ہے اور مختلف ادوار میں عالمِ ادب کی رہنمائی کا بار اٹھاتی رہی ہے۔

جناب فیض بھرتپوری نے مرثیہ گوئی کا آغاز اس وقت شہر کراچی میں کیا جب یہاں لکھنؤ اور عظیم آباد کے بعد تیسرا مرثیہ کا بڑا دبستان قائم ہو چکا تھا۔ یہاں کلاسیکی مرثیہ کا ذوق بھی باقی ہے اور جدید مرثیہ کے اثرات بھی موثر ہیں۔ اس لئے یہاں وہی شاعر زیادہ مقبول رہے ہیں جنہوں نے ان دونوں مکاتب کے مطالبات کو ملحوظ رکھا ہے۔ جناب فیض نے رنگِ قدیم میں رنگِ جدید کی آمیزش بہت احتیاط اور ہنرمندی کے ساتھ کی ہے۔

جناب فیض کے زیادہ تر مرثیے بیانیہ ہیں سوائے ایک مرثیہ کے جو پانی کے موضوع پر کہا گیا ہے اور جو اس صنفِ سخن سے مماثلت رکھتا ہے جسے اب اصطلاحاً بعض حضرات مسدس کہتے ہیں۔ پانی کی جو اہمیت واقعۂ کربلا کے سیاق و سباق میں ہے اس نے اسے ایک بہت نمایاں موضوع بنا دیا ہے چنانچہ فیض صاحب کے علاوہ جناب جوش ملیح آبادی، مرحوم راجہ صاحب محمود آباد اور جناب نسیم امروہوی نے

اس موضوع پر مستقل مراثی کہے ہیں۔

پانی چونکہ عناصر فطرت میں ہے اس لئے پانی سے متعلق شاعری میں منظر نگاری کا وسیع حصہ رہا ہے۔ فطری مناظر کی کیفیت کو اجاگر کرنے میں فیض صاحب نے زبان کی ملائمت، لوچ اور نزاکت سب سے کام لے کر ایسے مرقع پیش کئے ہیں:۔

سب کو ہے فیض رساں بارشِ رحمت اس کی سب زمانے پہ عیاں اصل و حقیقت اس کی
دولت ہستیٔ کونین بدولت اس کی دوست دشمن پہ برابر ہے عنایت اس کی

مہرباں سب پہ ہے چاہے کوئی بدکیش سہی
شاہ و درویش ہیں محتاج کم و بیش سہی

پانی کی فکری تشریح بھی عمدہ اور طالب توجہ ہے:

مختلف نام ہیں پانی کے بھی حسب محل یہ فضاؤں میں ہے شبنم، تو فلک پہ بادل
خاک پر ہو تو ہے زمزم۔ کہ نہیں جس کا بدل چرخ پہ ہو تو ہے کوثر کہ جو صد رشک عسل

ایک وہ آب ہے رحمت کی جو بوچھار میں ہے
ایک وہ ہے جو ید اللہ کی تلوار میں ہے

گریز کا بے ساختہ پن بھی لائق داد ہے:

اتنی افراط سے دنیا میں ہے آیا پانی
پھر بھی احمد کے نواسے نے نہ پایا پانی

جدید مرثیہ کے فروغ سے بین نگاری کے طریق میں تھوڑا سا فرق یہ آیا ہے کہ شجاعت کے مناظر اور بکا کے مناظر کے رسمی فاصلے بتدریج کم ہوتے گئے ہیں اور اب بیک وقت عزم و عزاء کے جذبات نمایاں ہوتے ہیں۔ جناب علی اصغر علیہ السلام کی شہادت میں فیض صاحب نے جنگ خیبر سے ربط دے کر اسی رُخ سے پیش کیا ہے۔

قاتل حرب ید اللہ ہوئے جن و بشر جو کسی سے نہیں جھکتے تھے جھکے اُن کے بھی سر
زور و قوت میں علیؑ سب سے زیادہ ہیں مگر کم نہیں معرکۂ کرب و بلا میں اصغرؑ

واں بڑی جنگ ہوئی تب درِ خیبر اُلٹا
یاں زباں ہونٹوں پہ پھیری تھی کہ لشکر اُلٹا

دل کا مضبوط تھا کتنا شہ صابر کا پسر　تیر گردن پہ پڑا بل نہ پڑا ماتھے پر
حسب منشائے پدر کار خدا پر تھی نظر　نام اصغرؔ تھا، کیا رن میں جہاد اکبر
کیوں نہ ہوتے یہ جری خونِ علیؑ شامل تھا
ننھی سے جان تھی اور شیرِ خدا کا دل تھا

اسی طرح یہ بیت بھی ہے:

کہہ کے لبیک جو تانے ہوئے سینہ آیا
ظلم کو صبر کی ہیبت سے پسینہ آیا

جناب فیضؔ نے رزم کے گوشوں پر خاص توجہ دی ہے۔ گرچہ فی زمانہ یہ وہ گوشہ ہے جس سے شعراء عموماً گریز کرتے ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ دبستانِ لکھنؤ کے اساتذہ نے لڑائی کے موقعوں میں جو قوت صرف کردی اس کے بعد اس میں کامیابی عملاً محال نظر آتی تھی اس لئے آج کا کوئی شاعر لڑائی کا کوئی واضح، روشن اور متحرک منظر پیش کرتا ہے تو وہ متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا:

نامِ عباسؑ کی ہیبت سے جو دل تھرّایا　فوجیں سمٹیں پسرِ سعد بہت گھبرایا
بدحواسی میں بگڑ کر یہ شقی چلّایا　کس کی دہشت سے سپاہیوں نے قدم سرکایا
بزدلو چلنے الیاس نہیں آئے ہیں
حر ہے حر، جنگ کو عباسؑ نہیں آئے ہیں

اسی طرح تلوار کی تعریف میں یہ بند طالب توجہ ہے:

اس دبدبے سے تیغ شہنشاہِ دیں چلی　گردوں لرز کے رہ گیا ڈر سے، زمیں چلی
عباسؑ کی طرح جو وہ چیں بر جبیں چلی　ایسی چلی کہ پھر نہ کبھی وہ کہیں چلی
اب تک لبوں پہ سکۂ ضرب درشت ہے
ہر تیغ سرنگوں ہے سپر کوزہ پشت ہے

اس بیت میں جو طنز ہے وہ لوازم میں قدیم ہوتے ہوئے بھی اپنی کاٹ اور معیار تحقیق میں جدید ہے۔

فیض صاحب کی زباں رواں ہے اور خطابت مطلق نہیں ہے۔ رجز کے مواقع پر بھی معترس اور پُر شکوہ ترکیبوں سے کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ سادگی و پُرکاری کے لئے ملائم الفاظ کے کشیدہ اصوات سے گونج کی کیفیت پیدا کی گئی ہے۔

تیغ زن مل کے بڑھی برچھیوں والے روکیں
حُر نہیں رُکنے کا۔ گر لاکھ رسالے روکیں

جنگ کے علاوہ مختلف روایات کے صرف میں بھی جناب فیض نے صحت اور سخنوری دونوں کا حق ادا کیا ہے:

طاعت میں آپ فخر جناب خلیل ہیں ایثار میں ذبیح صفت بے عدیل ہیں
محویتِ سجود میں حق کی دلیل ہیں دنیا میں صرف دو ہی تو سجدے طویل ہیں
اِک سجدہ وہ کہ پُشتِ نبی پر حسینؑ تھے
اک وہ کہ زیرِ تیغ شہِ مشرقین تھے

اس آخری مصرع کی یوں توجیہہ کی گئی ہے:

فکرِ نجات خلق جو طاعت سے مل گئی
سجدے کی حد۔ حدودِ قیامت سے مل گئی

جناب فیض کی مرثیہ نگاری مسلسل عمل ارتقاء میں مصروف ہے اور مجھے یقین ہے کہ دائمی اور عصری تقاضوں کو انہوں نے جس انداز سے ملحوظ رکھا ہے وہ ان کے لئے دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کا باعث ہوگی۔

☆☆☆☆☆

کتاب۔ سربکف

شاعر۔ صبا اکبرآبادی

سنِ اشاعت: ۱۹۸۰

# تاثرات

صباؔ صاحب کے مراثی میں جدید محاسن و مزاج کی پیوستگی بہت خوش سلیقگی سے کی گئی ہے۔ جب ہم صباؔ صاحب کے مراثی کے خصوصی اجزاء پر نظر ڈالتے ہیں تو وہاں بھی جدت نظر آتی ہے۔ شہادت کے مناظر میں جذب صباؔ اکبرآبادی نے اپنے مفکرانہ رنگ کوئی ملحوظ رکھا اور ساتھ ہی شجاعت اور صبر دونوں جذبات کو متوازن رکھ کر رزمیہ گوشوں کو پُر کیا ہے اس کے ساتھ ہی مقصدِ شہادت کی وضاحت نے مل کر صباؔ اکبرآبادی کے مراثی میں شہادت کے ایسے محتشم مناظر پیش کئے ہیں جس کے ذیل میں فلسفۂ مذہب اور فلسفۂ زندگی کے تمام گوشوں پر بھرپور اور مدلّل گفتگو کی جا سکتی ہے۔

جدید شاعری کا جو مزاج بنتا جا رہا ہے اس میں ہر چند بعض گوشوں میں فکری شاعری کو ترقی نصیب ہوئی ہے لیکن روایتی شاعری میں جو مذہبی اور اخلاقی مضامین حمد و نعت کے ملتے ہیں ان پر اعلیٰ فکری سطح پر رہ کر شعر گوئی کا حوصلہ عام نہیں رہا۔ حمد و نعت آسان اصنافِ سخن نہیں ہیں اور اُردو زبان کے بہت کم گو شاعر محض نعت گوئی کے سبب شہرت حاصل کر سکے ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ جو نعت اَدب کے بلند پایہ مقامات کو چھو لیتی ہے اُسے تائیدِ غیبی بھی یقیناً حاصل ہوتی ہے۔ جناب صباؔ اکبرآبادی نے بھی مرثیہ کا وسعت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے رسولِ برحق کی شان میں اتنی رواں، اتنی پُرشکوہ اور اتنی دل آویز نعت کہی ہے جس کی مثال موجودہ عہد کی شاعری میں ملنا محال ہے۔

علامہ طالب جوہری

☆☆☆☆☆

کتاب۔ سرِ نینوا

شاعر۔ اُمید فاضلی

سنِ اشاعت: ۱۹۸۲

# تاثّرات

اُمید فاضلی اس دورِ جدید کے نہایت خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں۔ انہوں نے مرثیہ نگاری کے میدان میں جو سعی و کاوش کی ہے، اس کی بناء پر میں ہمیشہ اُن کے لئے دُعا گو رہا ہوں۔ جو ناموری انہیں نصیب ہوئی ہے وہ خلوصِ نیت کے بغیر ممکن نہ تھی۔ خود کہتے ہیں۔

لیلئ جاں جو عشق کا محمل بھی چاہئے
اس راہ میں زباں ہی نہیں دل بھی چاہئے

جناب اُمید مرثیہ نگاروں کی جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نے رزمیہ کے تصور کو وسعت دی ہے۔ اُمید فاضلی کے مراثی کے خصوصی اجزاء میں تخلیق کے ارتقائی مراحل کی منظر نگاری شامل ہے جسے انہوں نے موثر بیانیہ پیرایۂ اظہار دیا ہے، ان مناظر کی پیش کش میں مفکرانہ سنجیدگی بھی ملتی ہے اور مصورانہ شان بھی۔ اُمید فاضلی نے ان اجزاء کو نعتیہ مضامین سے جس بلاغت اور نفاست کے ساتھ پیوست کیا ہے وہ ان کی انفرادیت کی واضح دلیل ہے۔

گہوارے میں تھی عقل تو انعام اور تھے
جب گھٹنیوں چلی ہے تو اقدام اور تھے
جب سن ذرا بڑھا ہے تو احکام اور تھے
نامِ خدا شباب میں پیغام اور تھے
معیارِ عقل دیکھ کے تعلیم دی گئی
آخر میں کُل نور کی تجسیم دی گئی

مرثیے میں نعتیہ مضامین کو فروغ دے کر امید فاضلی نے ثابت کیا ہے کہ اس مشکل ترین صنف کو وسعت بیان کی بہت ضرورت ہے۔ میں نے کہیں تحریر کیا تھا کہ روایتی شاعری میں جو مذہبی اور اخلاقی مضامین حمد و نعت کے ملتے ہیں ان پر اعلیٰ فکری شاعری کا حوصلہ عام نہیں رہا ہے۔ امید فاضلی کے کلام سے واضح ہے کہ نعتیہ مضامین رزمیہ کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں اور رزمیہ پیرائے کو نعت کا موثر ذریعۂ اظہار بنایا جا سکتا ہے۔

قرآن اعتبارِ محمدؐ کا نام ہے
یہ اعتبارِ دل کی اساسِ تمام ہے
قائم اسی اساس پہ حق کا نظام ہے
جس کو نبی کہیں وہ خدا کا کلام ہے
اکمل بشر کو جلوۂ کامل دیا گیا
انسانیت کو نور میں شامل کیا گیا

تاریخی تفاصیل کے بیان میں بھی معیار کی یہ ہمواری برقرار ہے۔ یہ منظر دیکھیے جہاں سرورِ کائناتؐ سورۂ کوثر کو دیوارِ حرم پر آویزاں کرتے ہیں۔

سر خم تھے سب کہ آیۂ کوثر کے سامنے
ساکت تھے لب بلاغِ 'وانحر' کے سامنے
حالت بتر تھی معنیٔ ابتر کے سامنے
قطرے لرز رہے تھے سمندر کے سامنے
کفار کے طلسم فضا میں بکھر گئے
الفاظ گنگ ہو گئے چہرے اتر گئے

مجھے جناب امید کے مراثی کا مسودہ ایامِ عزا میں ملا ہے۔ اور میں اپنی انتہائی مصروفیت کی بناء پر ان کی مرثیہ نگاری کا تفصیلی جائزہ لینے سے قاصر ہوں اس لئے ان چند اشارات پر اکتفا کر رہا ہوں۔

امید فاضلی نے اپنے اکثر مراثی میں یہ التزام برتا ہے کہ وہ پنجتن پاک کے پورے سلسلے کی مدح

ترتیب وار کر کے مرثیے کے رزمیہ اور بینیہ حصے تک پہنچتے ہیں۔ جس سے مرثیے کے تمام اجزاء فکری اور فنی دونوں اعتبارات سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور اوّل کا ربط آخر سے رہتا ہے۔

اک محمدؐ دشمنی کیا کیا قیامت ڈھا گئی
بدر کی حد بڑھتے بڑھتے کربلا تک آ گئی

مرثیے کے کلاسیکی عناصر رجز، تلوار کی تعریف اور شہادت کے منظر کو انہوں نے نہایت محنت و کاوش سے پیش کیا ہے۔ ان مقامات پر برجستگی اور روانی کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اور مناظر کے مجموعی اختتام کو بھی۔

رجز۔ آقا کہیں تو وقت کے طوفاں کو روک دوں
تم لوگ کیا ہو گردشِ دوراں کو روک دوں

تلوار۔ یہ پری گھونگھٹ سے نکلی تو پرے ہٹنے لگے
جسم ادھر چھٹنے لگے اور سَر اُدھر کٹنے لگے

شہادت۔ کیا وقت آ گیا تھا محمدؐ کے دین پر
طوبیٰ کی شاخ کٹ کے گری تھی زمین پر

ان مضامین کی ادائیگی میں جو ندرت برتی گئی وہ اس لئے خاص طور پر قابل قدر ہے کہ امید فاضلی ان شعراء میں سے ہیں جن سے مرثیے کے مستقبل کی بھی امیدیں وابستہ ہیں اس لئے جدید مفکرانہ مزاج سخن اور غم انگیز فضا کو قائم رکھنے کے ساتھ مرثیے کے رزمیہ گوشوں پر توجہ دے کر انہوں نے اپنی متاعِ ہنر میں اضافہ کیا ہے۔

علامہ طالب جوہری

☆☆☆☆☆

کتاب۔ خونناب

شاعر۔ صبا اکبرآبادی

سن اشاعت: ۱۹۵۸

# تاثرات

صبا اکبرآبادی ایک ایسے عہد ساز شاعر ہیں جن کی آواز کی گونج اردو ادب و شعر میں بہت دور اور بہت دیر تک سنائی دیتی رہے گی۔ خصوصیت کے ساتھ غزل، رباعی اور مراثی کے سلسلہ میں ان کی کاوشیں کسی طرح نہیں بھلائی جاسکتیں۔

صبا صاحب کی تمام شاعری روایت اور درایت کا حسین امتزاج ہے۔ صبا صاحب کے ہاں جدید محاسن و مزاج کی ہم آہنگی بہت خوش سلیقگی سے کی گئی ہے۔ صبا صاحب کے مراثی کے چہروں میں جدیدیت کی ایک ایسی آمیزش نظر آتی ہے جو روح عصر کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہے۔ شہادت کے مناظر میں بھی صبا اکبرآبادی صاحب نے اپنے مفکرانہ رنگ کو محفوظ رکھا ہے اور شجاعت اور صبر دونوں جذبات کو متوازن رکھ کر رزمیہ گوشوں کو پُر کیا ہے۔ یہ بیت ملاحظہ ہو۔

بے شیر کا مزار نہیں جذبِ صبر ہے
تلوار سے گھدی ہے سپاہی کی قبر ہے

اس کے ساتھ ہی مقصد شہادت کی وضاحت نے مل کر جناب صبا اکبرآبادی کے مراثی میں شہادت کے ایسے محتشم مناظر پیش کئے ہیں۔ جس کے ذیل میں فلسفہ، مذہب اور فلسفۂ زندگی کے تمام تر گوشوں پر بھرپور، مکمل اور مدلل گفتگو بھی ملتی ہے۔ وہ ایک انتہائی باکمال شاعر تھے اور میں اُن کے کمال کا معترف بھی ہوں اور مداح بھی۔

علامہ طالب جوہری

☆☆☆☆☆

کتاب۔ جلتے خیمے

شاعر۔ ثاقب مظفرپوری

سن اشاعت: ۱۹۸۶

# ثاقب صاحب کے سلام

اردو میں سلام کی صنف کو عرصۂ دراز تک مرثیہ کی ذیلی صنف کے طور پر برتا گیا۔ مرثیہ گو شعراء حاضرین مجلس کو متوجہ کرنے کے لئے مرثیہ سے پیشتر سلام پڑھا کرتے تھے اور چونکہ فن کا بھرپور اظہار مرثیہ کے لئے وقف ہوتا تھا اس لئے سلام کو وہ اہمیت حاصل نہ ہو سکی جس کا وہ مستحق تھا۔ لیکن شاعری کی جو بھی صنف ذکر محمدؐ و آل محمدؐ کو اپنا شعار بناتی ہے خداوند عالم اسے عزت و تکریم سے محروم نہیں رکھتا۔ اب آج کے عہد میں سلام کی اتنی توقیر ہے کہ بعض شعرائے کرام کی شہرت کا دارومدار زیادہ تر اسی صنف پر ہے۔ جیسے شہید یار جنگ وغیرہ۔

صوری اعتبار سے سلام غزل سے مشابہ ہے لیکن یہ صنف غزل سے زیادہ قدرت سخن کا تقاضہ کرتی ہے، اس لئے کہ غزل میں موضوعات معین نہیں ہوتے جبکہ سلام کے موضوعات بھی معین ہیں لہذا میری نگاہ میں سلام کی صنف میں اپنی انفرادیت کو اجاگر کرنا غزل کی نسبت زیادہ دشوار کام ہے۔ سلام کے مضامین کے معین ہونے کے سبب یہ گمان ہو سکتا ہے کہ یہ صنف اپنے تاثر اور تخاطب میں بہت محدود ہے۔ یہ گمان برمحل ہوتا اگر اسلام اپنے دامن میں اخلاق اور حکمت ان تمام جواہر کو سمیٹ نہ لیتا جو غزل کے انحطاطی مزاج سے میل نہیں کھاتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر انیسؔ کے سلام سے خالصۃً عزائیہ اشعار خارج کر دیئے جائیں تو انیسؔ کی شاعری پیرایۂ غزل میں اخلاق اور حکمت کی نہایت دل آویز تصویریں پیش کرے گی۔

جس طرح مرثیہ نے کئی ارتقائی مراحل طے کئے ہیں اسی نسبت سے سلام کی صنف نے بھی

کروٹیں لی ہیں اور آج کا سلام کلاسیکی عہد کے سلام سے الگ مزاج رکھنے لگا ہے۔ اس کے موضوعات میں بھی وسعت آئی ہے اور عزائیہ اشعار کا ذہنی افق بھی وسیع تر ہوتا گیا ہے۔ اور اب سلام کا مزاج عصری مسائل سے بھی ہم آہنگ ہونے لگا ہے۔

مجالسِ عزا میں گاہے بگاہے جناب ثاقبؔ مظفر پوری کو سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے ان کے اشعار میں برجستگی، پختگی اور قدرتِ اظہار کو ہمیشہ محسوس کیا ہے۔ اگرچہ ان کے کلام پر بعض صفِ اوّل کے مرثیہ گویوں اور شاعروں کا رنگ کہیں کہیں جھلکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے اشعار ان کی انفرادیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ مجالس میں سنے ہوئے بعض اشعار میرے ذہن پر نقش ہو گئے ہیں اور یہی اشعار ان کے کلام کی ندرت اور اظہار کے بانکپن کو ظاہر کر دینے کے لئے کافی ہیں۔

گھوڑے سے شاہ گرتے ہیں ہشیار اے زمیں — آغوشِ فاطمہؑ کی امانت کی بات ہے

ثاقبؔ غدیر پر ہی نہیں ختم سلسلہ — میدانِ کربلا بھی ولایت کی بات ہے

حملہ کیا تبسمِ اصغر سے شاہ نے — اچھی طرح یزید کی طاقت کو تول کے

جناب ثاقبؔ نے اکثر مشکل زمینوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور ان سلاموں میں قدرتِ سخن کے ساتھ ان کے جذبہ کی صداقت بھی ظاہر ہوتی رہی ہے۔ میں دست بدعا ہوں کہ خداوندِ تعالیٰ انہیں خدمتِ ذکرِ حسینؑ کی توفیق کے ساتھ سلامت رکھے۔

علامہ طالب جوہری

☆☆☆☆☆

maablib.org

مرتب: وصفر

شاعر: شاہد نقوی

سن اشاعت: ۲۰۰۷

# شاہد نقوی کے مرثیے میری نظر میں

## از جناب مستطاب علامہ طالب جوہری صاحب زاد اللہ علمہٗ

استدلال کے جو طریقے یونانی اور اسلامی منطق میں متعین کئے گئے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جس میں استدلال کی شکل وصورت سے بحث کی جاتی ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ جب استدلال کیا جائے تو مقدمات کی ترتیب کس شکل کی ہو اور انتاج صحیح کی شرائط کیا ہوں۔ انہیں اشکال اربعہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دوسری قسم میں موضوع اور مقصد استدلال کے اعتبار سے استدلال کو پانچ قسموں میں منقسم کیا گیا ہے اور انہیں صناعات خمس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ مندرجہ ذیل ہیں۔

الف: کبھی استدلال اس لئے کیا جاتا ہے کہ انسان چند معلومات کے ذریعہ کسی مجہول حقیقت تک پہنچ جائے اور وہ مجہول حقیقت اس کیلئے معلوم بن جائے۔ یہ طریقہ استدلال دنیا کے ہر علم میں رائج ہے اور ساری دنیا کے عقلاء اور دانشور اپنے افکار کو اسی طریقہ استدلال کے ذریعہ پیش کرتے ہیں اس استدلال میں کشف مجہول کے لئے جو معلومات استعمال کئے جاتے ہیں وہ بدیہی مشاہداتی، تجرباتی اور یقینی ہوتے ہیں۔ منطق کی اصطلاح میں اس کا نام برہان ہے۔

ب: کبھی استدلال اس لئے کیا جاتا ہے کہ انسان بحث میں فریق مخالف کو مغلوب کرلے اور اس سے اپنی بات منوالے۔ اس طریقہ استدلال میں یہ ضروری نہیں ہے کہ معلومات یا امور یقینی ہوں بلکہ اس میں ایسے امور سے استدلال کیا جاتا ہے جنہیں فریق مخالف تسلیم کرتا ہو چاہے وہ یقینی ہوں یا غیر یقینی اور عامۃ الناس کے لئے قابل قبول ہوں یا نہ ہوں۔ اس کا نام جدل ہے۔

ج: کبھی استدلال اس لئے کیا جاتا ہے کہ مخاطب کو کسی کام کے کرنے یا چھوڑنے پر مطمئن اور آمادہ کیا جا سکے۔ اس میں ظنی اور غیر یقینی امور سے دلیل پیش کرنا کافی ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص سے سگریٹ چھڑوانی ہو تو سگریٹ نوشی میں ضرر کے جو احتمالات ہیں وہ بیان کئے جائیں گے۔ اس کا نام خطابت ہے۔

د: کبھی استدلال اس لئے کیا جاتا ہے کہ خطابت کے تصور کو کسی چیز یا ذات کی اچھائی یا برائی باور کرادی جائے۔ اس صورت میں اس چیز یا ذات کو اچھائی یا برائی کا ایک تصوراتی لباس پہنا دیا جاتا ہے۔ علم معانی و بیان کے مختلف مباحث تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور مجاز وغیرہ اس قسم میں شامل ہیں۔ اس کا نام شعر ہے۔

ہ: کبھی استدلال اس لئے کیا جاتا ہے کہ مخاطب کو ایک غلط بات باور کرادی جائے یہ مغالطہ ہے۔ اس گفتگو سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ شعر کا اپنا ایک مخصوص طریقۂ استدلال ہے جو بقیہ چاروں طریقوں سے مختلف ہے؟ شعر نہ برہان ہے، نہ جدل، ورنہ خطابت ہے نہ مغالطہ۔ اس کے معلومات کی بنیاد یقنیات پر نہیں ہوتی بلکہ احساسات اور جذبات پر ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ کسی عہد کے کسی شعر کو فن تنقید نے منطق کی کسوٹی پر نہیں پرکھا اس لئے کہ اس کے پرکھنے کی میزان منطق نہیں بلکہ ذوق سلیم ہے۔

شاہد نقوی کی شاعری کی سب سے بڑی پہچان ان کی وہ شعریت ہے جو اپنے پورے سفر میں کہیں بھی برہان کا دامن نہیں چھوڑتی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ فقط استدلال کے ناظم ہیں۔ وہ ایک بھرپور شاعر ہیں، اسی لئے میں نے ان کی پہچان شعریت کو قرار دیا ہے نری برہانیت کو نہیں۔ وہ شاعری کی زمین پر اتنی استادی اور فنی مہارت کے ساتھ صغریٰ اور کبریٰ کے شجر اگاتے ہیں کہ ذہن خود بخود نتیجہ تک پہنچتا ہے اور اسے قبول کرتا ہے۔ ان کے مراثی کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے سر سے سوچتے ہیں اور اپنے سینے سے نظم کرتے ہیں اس لئے کہ جب تک دماغ اور دل دونوں میں باہمی تعاون نہ ہو اچھے ادب کی تخلیق ناممکن ہے۔

جناب شاہد نے غیر منقسم برصغیر میں آنکھ کھولی اور عہد شعور میں قدم رکھنے کے بعد ہر اس تحریک

سے متاثر ہوئے جو اس عہد کے معاشرے کو ترقی پسند بنانا چاہ رہی تھی۔ انہیں ترقی پسند تحریک اور مقاصد سے اتفاق تھا یا نہیں یہ ایک الگ مسئلہ ہے لیکن انہوں نے اس تحریک سے اثر قبول کیا یا نہیں اس کا جواب اثبات میں ہے۔ اس اثر نے ان سے جدید غزلیں کہلوائیں جن میں غمِ جاناں کم اور غمِ دوراں زیادہ ہوتا تھا اور آج تک ان کی غزلوں میں کم و بیش وہی مزاج ہے۔ اور پھر اسی اثر نے ان سے وہ نظمیں کہلوائیں جن میں اس عہد کے فیشن کے مطابق انقلاب کی گھن گرج اور بغاوت و آزادی کی خوشبو تھی۔ کراچی آنے کے بعد ان کی شاعری مشرف بہ اسلام ہوئی اور انہیں قصیدہ نگاری کے روپ میں فکر کی نکاس کا راستہ ملا۔ انہوں نے بلاشبہ اچھے قصیدے کہے اور ان میں مربوط و مسلسل خطوط فکر کی نشان دہی کی۔ لیکن یہ تنگنائے بھی ان کی جودت طبع کے لیے کافی نہ ہو سکا۔ اور پھر بڑی تگ و دو کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو ایک مرثیہ نگار کی حیثیت سے پہچان لیا۔

یوں تو اب بھی مختلف اصناف سخن میں ان کی مشق جاری ہے لیکن وہ اسے ذریعۂ عزت نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک ذریعۂ عزت فقط وہ ریاض تھے جو وہ مرثیہ کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ اب وہ اس منزل پر ہیں جہاں انہیں فن کی تکمیل اور رہنمائی دونوں سے عہدہ برا ہونا ہے۔

شاہد نقوی کا تعلق ان دو نسلوں سے ہے جن میں سے ایک آزاد ہونے کے لئے سر بکف تھی اور دوسری آزاد رہنے کے لئے کوشاں ہے۔ ان دونوں نسلوں کے درمیان جو خلاء پیدا ہوا ہے وہ شاہد نقوی کا خصوصی موضوع ہے اور اس پر وہ بہت دل لگا کر شاعری کرتے ہیں۔ یہ موضوع ان مقامات پر زیادہ اُبھر کر سامنے آتا ہے جہاں وہ آدمی نامہ نظم کرتے ہیں یا حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہیں۔ "سورج کا سفر" آدمی نامہ سے شروع ہوا ہے۔ اس میں شاعر بظاہر اپنے عہد کے آدمی کی بات کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے لیکن درحقیقت یہ ہر عہد کے آدمی کا تجزیہ ہے۔ یہی مزاج کم و بیش "انقلاب فکر" اور "اعتبار رسالت" کے چہروں میں بھی نظر آتا ہے۔ لیکن ان تینوں مقامات میں کوئی ارتقاء یا فکر کا کوئی نیا زاویہ محسوس نہیں ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا الفاظ بدل کر ایک ہی بات کو بار بار دہرایا جا رہا ہے۔ یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ ہر شاعر کے کچھ پسندیدہ مضامین ہوتے ہیں جنہیں وہ مختلف پیرایہ سے نظم کرتا ہے۔ غالب کے مختصر سے مجموعہ کلام میں اس کی بہت سی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔

شاہد نقوی کے ابتدائی مرثیوں پر جوش اور آلِ رضا کے اثرات بڑے گہرے تھے اور وہ اثرات اس حد تک تھے کہ اگر ایک مرثیہ جوش کے اثرات کے تحت ہے تو دوسرا مرثیہ خالصتاً آلِ رضا کے اسلوبِ کلام کی نمائندگی کرتا ہے۔ لیکن مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ شاہد صاحب نے اپنے کلام میں ان دونوں اسلوبوں کا جو آمیزہ تیار کیا ہے وہی ان کی انفرادیت ہے۔ اب وہ ایک صاحبِ طرز مرثیہ گو ہیں اور ان کی طرز میں نہ تنہا جوش کی تری ہے اور نہ تنہا آلِ رضا کی خشکی بلکہ خشکی و تری کا ایک ایسا گوارا امتزاج ہے جو ان کی ساخت کے مرثیوں کے لئے ناگزیر ہے۔

ان کے مرثیوں کے پرشور سمندر میں اکثر و بیشتر استدلال کی خشکی کے جزیرے ابھرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں لیکن وہ موضوع کی ضرورت ہیں اور نہیں نظر انداز کرنا موضوع کی اہمیت گھٹانے کے مترادف ہوگا۔ اگرچہ "نالہ جرس" نامی مرثیہ کے ساتویں بند میں انہوں نے فکر اور شعریت کے امتزاج میں اپنے طریقہ کار کو اس طرح سے واضح کیا ہے کہ ع شکوہِ فکر پہ حسنِ بیاں نثار نہ ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فکری شاعری کے ترجیحات عام رومانی اور بیانیہ شاعری سے مختلف ہوتے ہیں۔

الفاظ بھی انسانوں کی طرح قوموں اور قبیلوں میں منقسم ہیں۔ وہ بالکل انسانوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں، زندگی گزارتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔ کل حزب بما لدیھم فرحون کی روشنی میں ایک قبیلے کے لفظ دوسرے قبیلے میں اجنبی اور نامانوس ہوتے ہے اور جب تک ان کا آپس میں ایک دوسرے سے تعارف نہ کرایا جائے وہ نامانوس ہی رہتے ہیں۔ تعارف کا یہ فن اردو شاعری میں سب سے پہلے نظیر اور انیس نے روشناس کرایا اور جوش نے اسے کمال کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ اس پوری گفتگو کی بنیاد فقط یہ اصول ہے کہ کون سی فکر کس لفظ کو اپنے ابلاغ کے لئے زیادہ مناسب سمجھتی ہے۔ اگر یہ اصول شاعری کی گرفت میں آجائے تو یقیناً وہ ایک کامیاب شاعر ہے۔ لہٰذا خالص علمی، کلامی، سماجی اور فلسفیانہ مباحث کے ابلاغ کے لئے وہی لفظ استعمال کئے جائیں گے جو ان مباحث کا پوری طرح ابلاغ کر سکیں۔ شاہد صاحب نے اپنے مراثی میں اس کا التزام کیا ہے اور یہی وہ خشکی کے جزیرے ہیں جن کا میں نے مندرجہ بالا سطور میں ذکر کیا ہے۔

اس بحث کا ایک ضمنی لیکن مختلف زاویہ یہ ہے کہ اچھی خطابت، اچھی بات اور اچھا شعر اس وقت

تک پوری طرح محسوس نہیں ہوتا جب تک کہ یہ طے نہ ہو جائے کہ متکلم یا شاعر کے ذہن میں کس لفظ کی کیا قیمت ہے؟ اور اس کے ذہنی پس منظر میں اس لفظ کے لئے کیا تاثرات موجود ہیں۔ اس فلسفہ کی بہت واضح مثال غالب کا ایک شعر ہے۔

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

اس پورے شعر میں کلیدی لفظ "شخص" ہے۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ غالب کی نگاہ میں اس لفظ کی قیمت کیا تھی اور اس لفظ کے سلسلہ میں ان کا ذہنی پس منظر کیا تھا تو ہم اس شعر کی سادگی کے مقابلے میں اس کی پرکاری کو زیادہ اچھی طرح محسوس کر سکیں گے۔ اور یہی غالب کا کمال ہے کہ اس نے دوسری مصرع میں "رعنائی خیال" کو رکھ کر لفظ شخص کے سارے پوشیدہ تاثرات کھول دیے ہیں۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی شعر میں الفاظ کو پورے تاثر اور ان کی پوری قیمت کا ابلاغ ہو جاتا ہے تو وہ یقیناً درجہ اوّل کا شعر ہے۔ جناب شاہد نقوی کے یہاں ایسے شعروں کی کمی نہیں ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ان کی بیتوں میں یہ فنکاری زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ابتدائی چار مصرعوں میں کسی فکری لفظ کے لئے فضا بناتے ہیں اور اس فضا سے ان کی قیمت کا تعین کرتے ہیں اور پھر اس بیت میں استعمال کرتے ہیں۔ گویا یہ بھی ان کی ایک انفرادیت ہے۔

یہ ساری بحث جناب شاہد نقوی کے اسالیب کلام سے متعلق تھی کہ انہوں نے اپنی شعریت کے لئے کیسے سانچے معین کئے ہیں اور ان سانچوں میں اپنے فکری موضوعات کو کس طرح ڈھالا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ ضروری گفتگو یہ ہے کہ انہوں نے ذریعہ ابلاغ کے طور پر جس صنف سخن کو اپنایا ہے اس کے بارے میں خود ان کی رائے کیا ہے؟ یوں تو "ضرب مظلومیت" نامی مرثیہ میں انہوں نے مرثیہ اور اس کے متعلقات پر گفتگو کی ہے لیکن درحقیقت وہ گفتگو سرسری اور نسبتاً کم عمیق ہے البتہ "نالۂ جرس" کے ابتدائی بتیس بندوں میں انہوں نے مرثیہ نگاری کے شرائط و اسالیب و عناصر پر جو گفتگو کی ہے وہ بند درحقیقت شاہد نقوی کی مرثیہ نگاری کا منشور ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ان مطالب سے کلی یا جزوی اختلاف کرے لیکن اسے اس خلوص سے انکار ممکن نہ ہوگا جو اس پورے چہرے میں جھلکتا ہے اور جس کا

آغاز یہ مطلع ہے۔

میں چاہتا ہوں خطاؤں کا اعتراف کروں
ہے دل میں جن سے کدورت انہیں معاف کروں
جو داغ دامنِ دل پر ہیں ان کو صاف کروں
ہیں چل چلاؤ کے دن کس سے اختلاف کروں

ان چاروں مصرعوں میں شاعر کا قلم نہیں بلکہ اس کا دل بول رہا ہے۔ وہ دل جو ریب وریا سے پاک ہے، وہ دل جس میں خلوص اور محبت کا دریا موجزن ہے اور وہ دل کہ جو محسوس کرتا وہی کہتا ہے۔ لیکن اسے کیا کہا جائے کہ مرثیہ جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے اور اس کے تکنیکی عناصر زیرِ بحث آنے لگتے ہیں ویسے ہی ویسے لہجہ میں تندی اور تلخی پیدا ہوتی جاتی ہے مثلاً بیسویں، تیسویں اور چوبیسویں بند کی بیتیں اس کی بہترین مثال ہیں۔

غلط ہے یہ بھی کہ مقصد سے ان کو دوری ہے
غلط ہے یہ بھی کہ یہ لاحقہ ضروری ہے
کرو ثنائے فرس مدحِ سیف کیوں نہ کرو
مگر توازنِ فکر و نظر کا خوں نہ کرو

یہ جائے فکر ہے جذباتیت سے کام نہ لو
نہ ہو سلیقہ تو تبدیلیوں کا نام نہ لو

پھر لہجہ کی یہی تندی و تیزی آگے چل کر طنز میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کی بہترین دلیل تیسویں بند کی بیت ہے۔

جدید دور کے گر مرثیے مسدس ہیں
تو پھر حضور کے شہکار کیا مخمس ہیں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طنز نگاری شاہد نقوی کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے اور یہ طنز نگاری ان کی مرثیہ گوئی کے پورے عہد پر محیط ہے جس کے بیشتر نمونے ''نفسِ مطمئن'' اور کمتر نمونے اس مجموعہ میں پائے

جاتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ استدلال کی سنجیدگی اور شائستگی، طنز کی شوخی اور اس کے ہلکے پن کو برداشت نہیں کرتی۔ پھر بھی اگر طنز کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ

۱۔ شاعر کو اپنے استدلال پر اعتماد نہیں ہے۔ یا

۲۔ اسے اپنی قوت نظم پر اعتماد نہیں ہے کہ استدلال کو جیسا چاہیئے تھا ویسا پیش نہ کرسکا۔ لہٰذا طنز کا سہارا لے رہا ہے۔

بحمد اللہ اب یہ عنصر ان کے کلام سے کم ہوتا جارہا ہے اور غالباً اس میں مطالعہ کے اضافے کے ساتھ ساتھ عمر کے اضافہ کا بھی دخل ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب وہ اپنی قوتِ شعر کو استدلال کی نوک پلک سنوارنے میں صرف کر رہے ہیں۔

مرثیہ کے سلسلہ میں شاہد صاحب کے ذاتی خیالات کو ضربِ مظلومیت اور نالۂ جرس میں دیکھا جا سکتا ہے لیکن ان کے خیالات سے قطع نظر ان کے مراثی کی دو بڑی قسمیں ہیں: موضوعاتی اور کرداری۔ موضوعاتی مراثی میں خون اور پیغام، سورج کا سفر، نیابت رسول، پیکر آشتی، (جس کا نام اگر پیکر آشتی نہ ہوتا تو بہتر تھا) وغیرہ ہیں اور کردار سے متعلق مراثی میں علی کا شیر، بضعۃ الرسول اور شریکۃ الحسین وغیرہ ہیں۔

علی کا شیر کردار سے متعلق ایک مرثیہ ہے اور غالباً یہ اس عہد کا ہے جب شاہد نقوی مرثیہ گوئی میں اپنی منزل کی تلاش میں تھے۔ اور یہی سبب ہے کہ اس مرثیہ میں گھوڑے اور تلوار کی چھب اور چھل بل نظر آتی ہے جو ایک خالص شعوری کوشش ہے اس بات کی کہ شاعر نے ان کلاسیکی موضوعات کو بھی اپنے فن کا گھیرا سایہ بخش دیا ہے۔

شاہد نقوی جب کسی کردار پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کا تجزیہ تاریخ کی روشنی میں اور اس کی تحلیل نفسی خاندانی پس منظر میں کرتے ہیں اور پھر کمال یہ ہے کہ اس سخت مرحلہ میں بھی حفظ مراتب اور تقاضائے عقائد کا مکمل خیال رکھتے ہیں جبکہ یہ ایک ایسا سخت مقام ہے جہاں جمیل مظہری جیسے ذی علم اور قادر الکلام نے بھی ایسے مصرعے کہہ کر سکندری دکھائی ہے۔ ع زینب مرا ضمیر دوراہے پہ ہے کھڑا۔ اس کے برعکس شاہد نقوی کے یہاں میری معلومات کی حد تک کسی مقام پر درجہ عصمت اور منصب امامت وشہادت کے

منافی کوئی بات نظر نہیں آتی۔

علی کا شیر نامی مرثیہ کی یہ خوبی بھی قابلِ غور ہے کہ ابتدائی دو بندوں میں حضرت ابوالفضل علیہ السلام کے کردار کی سرخیاں اور عنوانات نظم کیے گئے ہیں۔ اور پھر انہیں تفصیل کے ساتھ پورے مرثیے میں پھیلایا گیا ہے۔ اس کوشش سے ایک طرف تو موضوع پر شاعر کی گرفت کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک کردار کا کتنے زاویوں اور کتنی جہتوں سے مطالعہ کیا گیا ہے۔

موضوعاتی مرثیے دراصل ان کی حقیقت نگاری کا شاہکار ہیں اس لئے کہ ان کا فطری رجحان بھی یہی ہے۔ خون اور پیغام میں ابتدائی سات بندوں میں عزاداری کی تاریخ جس خوبصورتی اور اختصار سے بیان کی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے لیکن اس کے فوراً بعد ستائیسویں بند تک خطابت اور موعظت کا ملا جلا رنگ ہے جس میں موعظت کا عنصر خطابت پر غالب ہے۔ خطابت اور موعظت شاعری کے دائرہ کار اور دائرہ اختیار دونوں سے باہر ہیں لیکن اگر شاعری کا کوئی مقصد متعین ہے (اور جیسا کہ متعین ہے) تو اسے گوارا کیا جا سکتا ہے لیکن نہ اس حد تک کہ سامع بے مزہ ہو جائے۔ پھر اس مرثیہ کا اٹھائیسواں بند مطلع ثانی ہے جس میں مطلع کی شان نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اس بند سے آخرِ مرثیہ تک بھرپور شعریت ہے اور خصوصاً وہ مقام جہاں سید سجاد علیہ السلام کے خطبے کے بعض اقتباسات کا ترجمہ کیا ہے وہ اس اعتبار سے بہت ہی عجیب ہے کہ اس میں آورد کا کوئی ذکر نہیں ہے اور وہ ایک خیال محسوس ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆

maablib.org

کتاب۔ لہو لہو کہکشاں

شاعر۔ شاہد نقوی

سنِ اشاعت: ۱۹۸۸

## عالیجناب علامہ طالب جوہری مدظلہٗ العالی

سامعین کرام!

اتنے اچھے مرثیے کے بعد کسی تقریر کی کوئی گنجائش نہیں رہتی اور میں آپ کے اور جناب شاہد نقوی کے درمیان حائل نہیں ہونا چاہتا۔ مجھے صرف اتنا کہنے کی اجازت دیجئے کہ ادب انسان کے جذبات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے اور یہ ذریعہ نثر کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے اور نظم کی صورت میں بھی بروئے کار آتا ہے۔ انسان جب اپنے کسی جذبے کا اظہار اشعار کے ذریعہ کرتا ہے تو جس قدر جذبہ گہرا ہوتا ہے اسی قدر شعر بھی بلند ہوتا ہے۔ اور مذہب اللہ کی مرضی کے اظہار کا نام ہے۔ اللہ جب اپنی مرضی کا اظہار بندوں پر کرتا ہے تو مذہب ہی کو ذریعہ بناتا ہے۔ مذہب اپنے مزاج میں صد حیرت رکھتا ہے۔ ادب کا بھی اپنا ایک مزاج ہے۔ اس میں وفا ہے۔ یہ دونوں جذبے ایک دریا کے دو کناروں کی مانند ایک دوسرے کے مقابلے چلتے رہتے ہیں اور کسی جگہ ملتے نہیں۔ مگر جس سرزمین پر یہ دونوں جذبے آپس میں معانقہ کرتے ہیں، جب یہ ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے ہیں، اس زمین کا نام ہے مرثیہ۔ اور صرف یہی وہ واحد صنفِ سخن ہے جس میں اللہ کی مرضی اور جذبۂ انسانی اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ یہ خصوصیت کسی اور صنفِ سخن کو حاصل نہیں، آپ کہیں گے کہ نعت، منقبت، سلام وغیرہ بھی تو ہیں۔ اس سلسلہ میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ یہ اصناف صرف اور صرف عقیدے کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ ادب اور مذہب کا مقامِ اتصال صرف مرثیہ ہے اور یہ وہ صنفِ سخن ہے جسے بلا تفریق، عقائد قبولیتِ عوام حاصل ہے۔ اس کی دنیا میں عقیدہ بھی ہے، ادب بھی ہے دین بھی ہے اور جذباتِ انسانی بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی مذہب کا انسان ہو۔ کوئی بھی عقیدہ رکھتا ہو۔ اپنے جذبات کا اظہار مرثیے کے ذریعہ جب بھی کرتا ہے تو صرف اور صرف شعور و جذبات کو سہارا بناتا ہے۔

قمر حسین (مرحوم) کے جملے:

شاہد بھائی کی اس عزت افزائی پر اُن کے احباب نے جو زبانی اور تحریری تہنیت پیش کی ہے اس میں شاعرِ حسینیت حضرت قیصر بارھوی صاحب کا قطعہ تاریخ اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث اس کا مستحق ہے کہ نذرِ سامعین کیا جائے۔

ملاحظہ فرمایئے۔

ادب سرشت مزاجوں نے فیصلہ یہ کیا
سخنوری ہے شہیدانِ کربلا کی عطا

یہ آستانۂ جوہر یہ علم و فن کے نگیں
خراج دے جنہیں تابندہ کہکشاں کی فضا

اسی فضا میں ہے اظہار مدعائے سخن
جسے دیانت فکر و نظر کہیں بخدا

بیانِ مرثیہ اس کے لبوں کی زینت ہے
جسے زبان پہ مقدور ہو یدِ طولیٰ

وہ شخص فلسفۂ کربلا کی بات کرے
رہینِ عقل ہو جس کی دلیل کا دعویٰ

وہی جلائے چراغِ سلیقۂ جدّت
جسے لگی ہو قدامت کے گلستاں کی ہوا

اُسی کے ذہن پہ کھلتے ہیں روشنی کے رموز
جسے ملا ہو درِ شہرِ علم سے صدقہ

مُحیط ہو غمِ شبیرؑ جس کی فطرت پر
بکھیرتی ہے اُجالے اسی کی عقلِ رسا

یہ گفتگوئے جدید و قدیم، کیا معنی
روش کے ساتھ خوشبوئے فکر کا چرچا

جو پُر خلوص رہا اپنے پیش رو کے لئے
اُسی کا اہلِ ادب نے ادب سے نام لیا

کلامِ شاہد نقوی سے یہ ہوا معلوم
شعورِ مرثیہ گوئی ہے مرثیے کی بقا

وہاں وہاں اثرِ "نفسِ مطمئنہ" ہے
جہاں جہاں نظر آتی ہے فکر و فن کی ضیاء

وہی اٹھائے زمانے کے فلسفے پہ قلم
جسے شعور ہو "والعصر" کی حقیقت کا

کیا ہے تبصرہ علامہ جوہری نے اگر
جواہراتِ سخن دیکھ کر کیا ہو گا

جواہرات شناسی پہ بات آ پہنچی
مرے شعور نے بے ساختہ یہ مجھ سے کہا

ہے مجتہد کا عطیہ یہ لاجواب خطاب
جناب شاہد نقوی "کلیمِ آلِ عبا"

اس انحطاط میں قیصر بہت غنیمت ہے
کسی کے دم سے اگر مرثیے کا حق ہو ادا

کتاب۔ کربِ جاوداں

شاعر۔ شاہد نقوی

سنِ اشاعت: ۱۹۹۲

## حجت الاسلام، آیت اللہ حضرت علامہ طالب جوہری مدظلہٗ العالی

جناب شاہد نقوی شہر کراچی کی وہ معتبر اور مستند سخن سنج ہیں کہ برصغیر کے موجودہ مرثیہ نگاروں کی صفِ اول اُن کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ مرثیہ گوئی اگرچہ شاہد نقوی کی وجہ شہرت ہے لیکن ان کی ذات کی مکمل پہچان نہیں ہے۔ اصناف کی درجہ بندی ہیئت کے اعتبار سے کی جائے یا موضوعات کے اعتبار سے، وہ جملہ اصنافِ سخن پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔

میں نے شاہد نقوی کے تعارف میں جان بوجھ کر شہر کراچی کا حوالہ دیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ عزیز حامد مدنی نے اپنے شعری مجموعے "دشتِ امکاں" کے دیباچے میں کراچی کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے "ایشیاء کی ہوائی شاہراہ پر مرطوب فضاؤں کی چادروں میں لپٹا ہوا شہر کراچی" شاہد نقوی اس شہر کراچی میں رہتے ہیں۔ لیکن انہوں نے نہ کراچی کی ہوا و فضا کا اثر قبول کیا ہے اور نہ اس کی رطوبت کا، حد یہ ہے کہ ان کے جذبات کی بے پردگی اس بات کا اعلان ہے کہ وہ اپنے جذبوں کو ابہام کی چادر میں لپیٹنا بھی پسند نہیں کرتے۔

جغرافیہ افراد پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور اقوام کی مجموعی مزاج پر بھی۔ افراد و اقوام کی یہی اثر پذیری انہیں الگ الگ ثقافتی خانوں میں تقسیم کرتی ہے۔ عرب کے بے آب و گیاہ ریگستانوں کا شاعر جو کچھ کہے گا وہ سراسر اس کلام سے مختلف ہوگا جو وادیٔ گنگ و جمن کے شاعروں کی تخلیق ہوگا۔ پہاڑی علاقوں کی شاعری میدانی علاقوں کی شاعری سے مختلف ہوگی۔ مختلف اقوام کا ادبی مزاج اس کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔ معلقات کے قصائد، حافظ و سعدی کی غزلیں اور تلسی داس کے دوہے اس کی واضح مثالیں ہیں۔

لیکن جن شعراء نے شعوری طور پر اپنے کلام کے عناصر کو ٹھیٹھ فطرت سے تالیف کیا ہے وہ جغرافیہ

کے بھرپور اور مکمل اثر سے محفوظ رہے ہیں۔ جغرافیہ عادتوں کو بدلتا ہے فطرت کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ زبان و لباس انسان کی عادت ہیں جنھیں جغرافیہ تبدیل کرتا رہا ہے لیکن ماں کی ماںتا اور باپ کی شفقت فطرت ہیں جنھیں نہ جغرافیہ بدل سکا نہ وقت۔ لذتِ کام و دہن کے طریقے جغرافیہ سے بدلتے رہتے ہیں لیکن بھوک جو فطرت ہے وہ چاند پر جانے کے باوجود تبدیل نہیں ہوئی۔ شاہد نقوی کی شاعری عادت کی نہیں فطرت کی شاعری ہے۔ وہ بنیادی طور پر فطرت کے عکاس ہیں اور ردِ عمل سے پیدا ہونے والے نتائج کے نقاد۔ ان کی اس فطری شاعری کے نمائندہ اشعار میں سے چند درج ذیل ہیں:

بند آنکھیں، لب کھلے، باتیں زیادہ کام کم
جی رہے ہیں اک انوکھے خواب کے عالم میں ہم

ہر روش پر معترض، بے محابا نکتہ چینی، مستقل تلخیِ غم
ہر فضا پر چیں بہ ابرو، ہر روش پر معترض

موت کی پُر ہول وادی کی طرف بڑھتے قدم
زیست کی اقدار اعلیٰ کا مسلسل مضحکہ

اپنے سینوں پر سجائے تمغۂ جہل تمام
اپنے کاندھے پر اٹھائے زعم بیجا کا علم

ایک مبہم گمرہی، اک مستقل آوارگی
وہم کی وادی میں سرگشتہ نظر کا پیچ و خم

جیسے دنیا کیا ہے بس طوفان ہی طوفان ہے
اور اس طوفان کی زد پر ہیں ہم اور صرف ہم

انسانی فطرت پر وقت و زماں کے عوامل جو کچھ کارفرمائیاں کرتے رہتے ہیں۔ انھیں یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ہر حال اپنے ماضی کی نسبت سے منفرد اور اپنے مستقبل کی نسبت سے مختلف ہوتا ہے۔ اس انفراد و اختلاف کے سبب زمانے کی ایک مخصوص اکائی دوسرے زمانوں سے الگ پہچانی جاتی ہے۔ غالباً اربابِ حکمت و دانش کی اصطلاح میں اس اکائی کے امتیازی خد و خال ہی روحِ عصر کہلاتے ہیں وہ انسان بہت عمیق اور ذہین انسان ہے جو روحِ عصر کو دریافت کر لے۔ شاہد نقوی کی شاعری روحِ عصر کی دریافت کی شاعری ہے۔ جو ان کی ہر تخلیق سے عیاں ہوتی ہے لیکن اس اضافے کے ساتھ کہ وہ روحِ عصر میں بھی ابدی اور آفاقی قدروں کی تلاش میں رہتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

مسلسل ہنس رہا ہوں درد پھر بھی کم نہیں ہوتا
غموں کا مضحکہ شاہد علاجِ غم نہیں ہوتا

فقط الفاظ سے عہدِ وفا محکم نہیں ہوتا
محبت نام ہے روحوں کے مل کر سانس لینے کا

کسی پر اعتبار اس صاحبِ محفل کو کیا آئے　　جہاں ہر آنے والا عذرِ رخصت ڈھونڈتا آئے

نہ ہو مانوس گر چشمِ مسافر حسنِ منزل سے　　تو منزل پر پہنچ کر بھی تجسس کم نہیں ہوتا

یا

اس کی محفل اور محفل میں کوئی اس کا نہیں　　ہائے وہ تنہا جو عرفِ عام میں تنہا نہیں

یا

حیات صرف جنوں ہے نہ صرف ہشیاری　　غنودگی سی ہے مابین خواب و بیداری

شاہد نقوی کے مجموعی تخلیقات کے انبار پر تبصرہ کرنا یا جائزہ لینا ایک بالاستیعاب عمل ہے۔ جس کا میں اس لئے متحمل نہیں ہوں کہ بیشتر تحریریں کثرتِ کار کے سبب ارتجالاً لکھی جاتی ہیں لیکن اگر ان کی فنی اور فکری کاوشوں سے سرسری گزرا جائے تو یہ صریح ناانصافی ہوگی۔ ان مختصر سطروں میں شاہد نقوی کی مذہبی شاعری زیرِ بحث ہے۔ اور یہ بحث اس وقت تک چھڑ نہیں سکتی جب تک کہ اسے مرثیہ نگاری کے تناظر میں نہ دیکھا جائے۔

قدیم مرثیہ نگاروں نے ہر ممکن کوشش کی کہ مرثیہ ادبی صنف رہے خالص مذہبی نظم بن کر نہ رہ جائے ورنہ میر انیس کو کیا ضرورت تھی کہ وہ ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کی کوشش فرمائیں۔ یہی سبب ہے کہ انیس و دبیر کو جہاں بھی موقع ملتا ہے وہاں زمینِ مرثیہ پر شعریت کے پھولوں کی تخم ریزی کرتے ہیں۔ اگر مرثیے کو کربلا یا ممدوحین تک مخصوص کر دیا جائے اور انہیں میں منحصر کر دیا جائے تو کسی غیر متعلق شخص کو اس میں کوئی کشش محسوس نہ ہوگی۔ لہٰذا متقدمین کو جہاں موقع ملا ہے شاعری کی ہے۔ سراپا، گھوڑا، تلوار، صبح کا سماں، دوپہر کی کیفیت، گرمی کی حالت اور ایسے ہی دیگر مباحث پوری جزئیات کے ساتھ نظم کیے گئے ہیں۔ شعرائے متقدمین کے فوراً بعد کے شعراء نے ساقی نامے کا بھی اضافہ کیا ہے جب کہ براہِ راست مرثیے کے اصل موضوع سے اس کا رابطہ تلاش کرنا مشکل بلکہ محال ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ مرثیہ کا حلقۂ مطالعہ اور دائرہ سماعت وسیع ہو اور اس کی افادیت میں اضافہ ہو۔

مجھے خوشی ہے کہ آج کے دور میں مرثیے کو بڑے طاقتور، ژرف نگاہ اور پڑھے لکھے شعراء ملے ہیں

لیکن مجھے افسوس ہے کہ مرثیہ جو ہیئت اور موضوع کا مواج شعری سمندر تھا اسے مخصوص مذہبی موضوعات کی تنگنائے بنا دیا گیا ہے۔ جس کے سبب اس کی حیثیت شعری مجروح ہوئی اور وہ منظوم مقالہ بن گیا۔ اس تقصیر میں شاہد نقوی شریک قوی ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے بڑی چابکدستی سے یہ کام کیا ہے کہ اپنے مراثی میں بعض چہرے ایسے نظم کیے ہیں جن کا تعلق عام انسانی زندگی سے ہے۔ اور بلا تفریق مذہب و ملت ایک عام قاری کے لئے جذب و کشش رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود شعریت کی کمی کا احساس برقرار رہتا ہے اگرچہ مذکورہ مقامات پر خال خال عمدہ اور مناسب شعری پیرایۂ اظہار بھی نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس ان کے قصائد شعریت کا بھرپور نمونہ ہیں ایسی شعریت جن میں جدیدیت بھی ہے اور معنویت بھی۔ فلاسفۂ شرق و غرب کے افکار پڑھے جا سکتے ہیں۔ انہیں کھنگالا اور نچوڑا جا سکتا ہے۔ انہیں سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ فارابی اور ابن سینا کو سمجھا جا سکتا ہے۔ میر باقر داماد اور صدرالدین شیرازی جیسے مشکل ایجاد حکماء کی نکتہ آفرینیوں سے لطف اٹھایا جا سکتا ہے لیکن زمین آج کی بہت سی ابہام زدہ، علامت خوردہ اور انغلاق پرورش شاعری کے فہم سے قاصر ہے۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ وہ بہت سی شاعری مہمل ہے بلکہ یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ اگر شاعری سے کسی قسم کا ابلاغ مقصود ہے تو جدید شاعری کا معتد بہ حصہ اس ابلاغی عمل سے محروم ہے۔ شعری جدیدیت صرف نئی ترکیبوں کے ایجاد کر دینے کا نام نہیں ہے۔ جدیدیت بے معنی تجریدی کا عمل نہیں بلکہ شعری جدیدیت اپنے عہد کے تازہ بہ تازہ مسائل پر بات کرنے کا نام ہے۔ جدیدیت سائنس اور ٹیکنالوجی کی حیرت ناک ارتقاء سے پیدا ہونے والی انسانی الجھنوں پر بات کرنے کا نام ہے خواہ وہ الجھنیں نفسیاتی ہوں، معاشرتی ہوں یا معاشیاتی ہوں یا کچھ اور۔ اس اعتبار سے شاہد نقوی کی شاعری ہر زاویے سے جدید شاعری ہے۔ وہ ہیئت کے برتنے میں انتہائی روایت پسند ہیں اور قدامت پرست ہیں۔ لیکن موضوعات کی تلاش اور پیشکش میں انتہائی جدید ہیں۔

قصیدہ آج کے عہد میں ایک متروک صنف سخن ہے پچھلے زمانوں میں مذہبی عقیدت رکھنے والے شاعروں نے دولت عقبیٰ کی خاطر اپنے ممدوحین کے لئے اور درباری شعراء نے دولت دنیا کی خاطر اپنے بادشاہوں اور دیگر اکابر کے لئے قصیدے لکھے تھے۔ آج جب کہ مذہبی گرفت کمزور اور شاہان و اکابر کی صف تقریباً مفقود ہو چکی ہے۔ قصیدے کی اہمیت بھی ختم ہو چکی ہے۔ لیکن قصیدوں کے زمانہ

عروج سے آج کے دور انحطاط تک اس طویل عرصے میں وہ لوگ بہر حال موجود رہے ہیں جو محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام کی دہلیز علم و طہارت پر زندگی گزارنا اپنا مقصد تخلیق سمجھتے رہے ہیں یہی سبب ہے کہ اپنے زمانوں میں محشر اور عزیز نے نظم طباطبائی اور نجم آفندی نے، والد مرحوم مولانا محمد مصطفےٰ جوہرؔ، حضرت جمیل مظہری اور پروفیسر اجتبیٰ رضوی زیبا ردولوی وغیرہم نے اس صنف سخن کو طاقِ نسیاں سے نکال کر جھاڑا پونچھا اور اپنے اپنے مزاج کے مطابق صیقل کی۔

آج کے تیز رفتار اور اختصار پسند دور میں شعراء نے نعت و منقبت کو قصیدہ کا نعم البدل قرار دے لیا ہے۔ شاہدؔ نقوی کو اس صنفِ سخن سے کیا دلچسپی ہے مجھے نہیں معلوم لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ جس طرح بعض شعراء نے غزل کو سلام سے بدل لیا تھا اسی طرح شاہد نقوی نے اپنے فطری نظم گوئی کے سارے جذبوں کو قصیدے کا پیرہن پہنا دیا ہے۔

قدیم قصائد اس بات کے آئینہ دار ہیں کہ تشبیب اور مدح میں کوئی ربط نہیں ہوتا۔ اور گریز کے ذریعے ان میں ربط پیدا کیا جاتا ہے۔ شاہد نقوی نے شعوری طور پر قصائد کی ایسی تشبیبیں تحریر کی ہیں جن میں تشبیب اور مدح مربوط بلکہ گتھی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس صنفِ سخن کا احیاء اور اس کی آسائش و زیبائش شاہدؔ نقوی کا وہ مخصوص ادبی پہلو ہے جس میں وہ بہت حد تک منفرد نظر آتے ہیں البتہ میں ان کے قصائد میں فن کا ایک اہم جزو دعا نہیں پاتا۔

ان چند سطروں کا یہ مفہوم نہیں کہ ان کا سارا تخلیقی عمل قصیدہ گوئی میں منحصر ہے۔ انہوں نے حمد و نعت و منقبت میں اپنی عقیدت اور اس سے زیادہ اپنی پختگی کے پھول کھلائے ہیں۔ لیکن قصیدہ چونکہ ان کے گلزارِ فن میں ایک قدِ آور سرو کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس کی الگ نشان دہی کی گئی ہے۔

طالب جوہری

maablib.org

☆☆☆☆☆

کتاب۔ کعبے سے کربلا تک

شاعر۔ ساحرؔ فیض آبادی

سنِ اشاعت: ۱۹۹۴

# تاثرات

## حجۃ الاسلام علامہ طالب جوہری

وہ شاعری جو خود کلامی نہ ہو بلکہ ایک پیغام ہو اس کے لئے سب سے بڑا مسئلہ ترسیل مفہوم کا مسئلہ ہے۔ اگر قاری یا سامع تک پیغام نہ پہنچ سکے تو شاعری کی مقصدیت مجروح ہو جاتی ہے۔ ترسیلِ مفہوم جان جوکھوں کا کام ہے اس کے لئے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ شعر میں جن لفظوں سے کام لیا جا رہا ہے وہ اس معنی کے عین مطابق ہوں جو شعر کے بنیادی مفہوم کا خام مواد ہے جیسا کہ جمیلؔ مظہری نے اپنے ایک مقطع میں کہا ہے

تلاشِ یک لفظ حسب معنی میں مظہریؔ نے گزاری راتیں
عزیزو دردِ سخنوری ہے تو دکھ اٹھاؤ سخنوری کے

دوسرے لفظوں میں حسب معنی لفظ کی تلاش ترسیل مفہوم کا پہلا مرحلہ ہے اور اس کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ لفظوں کے ایک مخصوص مجموعہ کو اس فکر کے اظہار کے لئے ایک لڑی میں پرو دیا جائے جو شعر کہنے کا سبب بنی ہے۔ شعر لفظوں کی مالا ہے۔ مالا کے دانے اگر ناہموار اور چھوٹے بڑے ہوں تو مالا تو بن جائے گی لیکن اُس میں حُسن و نفاست کی کمی بہرحال محسوس ہوتی رہے گی۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ شعر کی مالا کے سارے الفاظ ہموار اور ایک ڈھال ہوں۔ تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ لفظوں میں بھی اپنی نشست کے اعتبار سے تقدیم و تاخیر کی نزاکتیں پائی جاتی ہیں اور ذرا سی بے احتیاطی ان کی نازک مزاجی پر بار ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ایوانِ شعر میں لفظوں کی نشست ان کے علمی اور فکری رتبوں کے مطابق ہو۔ ان شرائط پر جو شعر پورا اترے گا وہ مکمل اور بھرپور شعر ہوگا اور ترسیلِ مفہوم کی پوری توانائیوں کا حامل ہوگا مجھے یہ لکھتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ جناب ساحرؔ فیض آبادی عہدِ رواں کے ان معتبر شاعروں میں ہیں جو فنِ شعر گوئی کی ان ساری نزاکتوں سے بخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

علوی ادب و بہ شمول رثاء و منقبت وسلام، عہد بنی عباس کے آغاز ہی سے مطالعہ سے زیادہ سماعت کا ادب رہا ہے۔ سماعت کے ادب کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ایسے الفاظ وتراکیب پر مشتمل ہوں جنہیں سمجھنے میں کدو کاوش اور گہرے تفکر و تدبر سے کام لیا جائے۔ لہٰذا اس ادب کی پہلی خصوصیت ایسا اسلوب کلام ہے جو زود فہم ہو اور ابہام و اغلاق سے پاک ہو اور دوسری خصوصیت وہ لب ولہجہ ہے جو انسان کے باطن کی گہرائیوں میں اُتر کر اسے متاثر کر سکے۔ ان دونوں خصوصیات کے اعتبار سے ساحرؔ اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور منفرد طرز بیان کے شاعر ہیں گویا انہوں نے اپنی شاعری میں اپنے مقصدِ تخلیق کو دریافت کر لیا ہے۔

ساحرؔ فیض آبادی کے بیشتر اشعار میں ایک ایسی خصوصیت پائی جاتی ہے جو ان کے ہم عصروں میں کم نظیر ہے اور وہ یہ ہے کہ شعر کی دینی حیثیت سے قطع نظر، ان کا شعر ادبی ساکھ بھی رکھتا ہے۔ میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ سامع یا قاری کو شعر کے مفہوم سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس کی شعریت اور پُرکاری سے اختلاف نہیں کر سکتا، مثلاً

غمِ حسینؑ سمو دو مزاجِ انساں میں — برائے ذوقِ شہادت بدن تلاش کرو
سیلِ اشکِ غم پہ موجیں کھا رہی ہیں پیچ و تاب — دیکھئے پانی کے ان قطروں سے دریا جل گیا
سینکڑوں غم اور ہزاروں سختیاں سہتے ہوئے — وہ ترا انکارِ بیعت لاکھ انکاروں میں ایک
بیعت نہ کر کے سبطِ نبیؐ نے بتا دیا — اکثر غلط بھی ہوتا ہے امّت کا فیصلہ
قدم بڑھاؤ ابوذر کی سربراہی میں — رہ جلا وطنی میں وطن تلاش کرو

جہاں ایک طرف ان اشعار کی پُرکاری انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہیں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ شاعر مشکل زمینوں پر طبع آزمائی کرنے میں زیادہ آسانی محسوس کرتا ہے۔

سہلِ ممتنع نثری ترکیب کی ایسی شاعری ہے جس کی نثر نہ بنائی جا سکے، حکیم آزاد انصاری اگرچہ نسبتاً کم معروف ہیں لیکن وہ سہلِ ممتنع کے بے مثل شاعر ہیں۔ مثلاً

اگر ارشادِ عالی ہو تو میں مایوس ہو جاؤں — بہت اغماض کی تکلیف فرمانے سے کیا حاصل
اگر آزاد سا درویش نظروں میں نہیں جچتا — تو جا اور جا کے اہلِ اللہ کی پہچان پیدا کر

علوی ادب کے دائرہ میں ساحرؔ فیض آبادی جیسی سہلِ ممتنع کی قدرت مشکل سے دیکھنے میں آتی ہے۔

اے ابو طالبؔ تمہارا یہ چلن اچھا لگا — نعت گوئی کا ادب آموز فن اچھا لگا
سورۂ کوثر کا اسلوبِ سخن اچھا لگا — دشمنوں کی ابتری بھی دوست کی تسکین بھی
جہلِ خرد کے سایہ پرستو، جہل بڑی گمراہی ہے — علم کی چودہ قندیلوں سے آنکھیں پھیرے بیٹھے ہو

مدحِ محمدؐ و آلِ محمدؐ خود ایک بڑا مقصد ہے لیکن ساحرؔ نے اپنے کلام میں معاشرتی اور تہذیبی مسائل پر گفتگو کر کے اسے افادیت مزید کا حامل بنا دیا ہے اور اس شاعری کی مقصدیت میں اضافہ کیا ہے۔ اس مجموعہ میں اتحادِ ملت کے عنوان سے ایک مکمل نظم کے علاوہ ایسے اشعار کی کمی نہیں۔

کہ ایک بھائی کو بھائی گلے لگا کے ملے — نبیؐ کی حکمِ مواخات کا تقاضہ ہے
یہ اک بسیط اشارہ ہے زندگی کی طرف — ہر امتحاں سے علیؑ کی طرح گزر جاؤ
آپس میں خلوص و محبت کا فیصلہ — ملت کا اتحاد ضرورت ہے وقت کی

اثنائے مطالعہ ایسے اشعار بھی نظر سے گزرے۔

بہت قریب ہے ہم نے سنی ہے دور کی بات — امینِ وحی بھی سدرہ سے آگے بڑھ نہ سکے
یزیدی چوب، حسینؑ چلن تلاش کرو — شکست و فتح کی تاریخ کے صحیفوں میں
وہ جو تھا دشمن بھی ہے پسِ دیوار — قلم سے کرتا رہا دینِ مصطفیٰؐ کا دفاع

ان اشعار میں آگے اور یزیدی کی یا اور الف دب رہا ہے۔ اگرچہ اساتذہ نے ایسے الف اور یاء کے دبنے کا جائز قرار دیا ہے، بعضوں نے اس جواز سے عملی فائدہ بھی اٹھایا ہے اور آج کی جدید شاعری میں تو اس کی طرف توجہ بھی نہیں کی جاتی لیکن اللہ نے ساحرؔ فیض آبادی کو جو قدرتِ کلام عطا کی ہے یہ اس کے منافی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ساحرؔ کی شاعری اتنی بے عیب ہے کہ یہ چھوٹی سی بات ترکِ اولیٰ کا ارتکاب محسوس ہوتی ہے۔ لیکن بحمد اللہ ایسے مواقع بہت شاذ ہیں۔

مجموعی طور پر زیرِ نظر مجموعۂ کلام علوی ادب میں ایک اضافہ ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ خوش ذوق قاری اس سے حظ حاصل کریں گے اور نو مشق اُسے اپنے لئے میزان قرار دیں گے، خداوندِ عالم بطفیل محمدؐ و آلِ محمدؐ جناب ساحرؔ فیض آبادی جو شعر و قلم کی خدمت سے سرفراز فرماتا رہے۔

طالبؔ جوہری

کتاب۔ صراط و سلسبیل

شاعر۔ شاہد نقوی

سن اشاعت: ۱۹۹۳

## حجت الاسلام، آیت اللہ حضرت علامہ طالب جوہری مدظلہ العالی

جناب شاہد نقوی شہر کراچی کی وہ معتبر اور مستند سخن سنج ہیں کہ برصغیر کے موجودہ مرثیہ نگاروں کی صف اول اُن کے نام کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ مرثیہ گوئی اگرچہ شاہد نقوی کی وجہ شہرت ہے لیکن ان کی ذات کی مکمل پہچان نہیں ہے۔ اصناف کی درجہ بندی ہیئت کے اعتبار سے کی جائے یا موضوعات کے اعتبار سے، وہ جملہ اصنافِ سخن پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔

میں نے شاہد نقوی کے تعارف میں جان بوجھ کر شہر کراچی کا حوالہ دیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ عزیز حامد مدنی نے اپنے شعری مجموعے "دشتِ امکاں" کے دیباچے میں کراچی کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے "ایشیاء کی ہوائی شاہراہ پر مرطوب فضاؤں کی چادروں میں لپٹا ہوا شہر کراچی" شاہد نقوی اس شہر کراچی میں رہتے ہیں۔ لیکن انہوں نے نہ کراچی کی ہوا و فضا کا اثر قبول کیا ہے اور نہ اس کی رطوبت کا، حد یہ ہے کہ ان کے جذبات کی بے پردگی اس بات کا اعلان ہے کہ وہ اپنے جذبوں کو ابہام کی چادر میں لپیٹنا بھی پسند نہیں کرتے۔

جغرافیہ افراد پر بھی اثر انداز ہوتا ہے اور اقوام کی مجموعی مزاج پر بھی۔ افراد و اقوام کی یہی اثر پذیری انہیں الگ الگ ثقافتی خانوں میں تقسیم کرتی ہے۔ عرب کے بے آب و گیاہ ریگستانوں کا شاعر جو کچھ کہے گا وہ سراسر اس کلام سے مختلف ہوگا جو وادیٔ گنگ و جمن کے شاعروں کی تخلیق ہوگا۔ پہاڑی علاقوں کی شاعری میدانی علاقوں کی شاعری سے مختلف ہوگی۔ مختلف اقوام کا ادبی مزاج اس کی مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔ معلقات کے قصائد، حافظ و سعدی کی غزلیں اور تلسی داس کے دوہے اس کی واضح مثالیں ہیں۔

لیکن جن شعراء نے شعوری طور پر اپنے کلام کے عناصر کو شعلۂ فطرت سے تالیف کیا ہے وہ جغرافیہ

کے بھرپور اور مکمل اثر سے محفوظ رہے ہیں۔ جغرافیہ عادتوں کو بدلتا ہے فطرت کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ زبان و لباس انسان کی عادت ہیں جنہیں جغرافیہ تبدیل کرتا رہا ہے لیکن ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت فطرت ہیں جنہیں نہ جغرافیہ بدل سکا نہ وقت۔ لذت کام و دہن کے طریقے جغرافیہ سے بدلتے رہتے ہیں لیکن بھوک جو فطرت ہے وہ چاند پر جانے کے باوجود تبدیل نہیں ہوئی۔ شاہد نقوی کی شاعری عادت کی نہیں فطرت کی شاعری ہے۔ وہ بنیادی طور پر فطرت کے عکاس ہیں اور ردعمل سے پیدا ہونے والے نتائج کے نقاد۔ ان کی اس فطری شاعری کے نمائندہ اشعار میں سے چند درج ذیل ہیں:

بند آنکھیں، لب کھلے، باتیں زیادہ کام کم
جی رہے ہیں اک انوکھے خواب کے عالم میں ہم

ہے بجا با تحت چینی، مستقل تلخیٔ غم
ہر فضا پر چیں بہ ابرو، ہر روش پر معترض

موت کی پُر ہول وادی کی طرف بڑھتے قدم
زیست کی اقدار اعلیٰ کا مسلسل مضحکہ

اپنے کاندھے پر اٹھائے زعم بیجا کا علم
اپنے سینوں پر سجائے تمغۂ جہلِ تمام

وہم کی وادی میں سرگشتہ نظر کا پیچ و خم
ایک مبہم گمرہی، اک مستقل آوارگی

اور اس طوفان کی زد پر ہیں ہم اور صرف ہم
جیسے دنیا کیا ہے بس طوفان ہی طوفان ہے

انسانی فطرت پر وقت و زماں کے عوامل جو کچھ کارفرمائیں کرتے رہتے ہیں۔ انہیں یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ہر حال اپنے ماضی کی نسبت سے منفرد اور اپنے مستقبل کی نسبت سے مختلف ہوتا ہے۔ اس انفراد و اختلاف کے سبب زمانے کی ایک مخصوص اکائی دوسرے زمانوں سے الگ پہچانی جاتی ہے۔ غالباً ارباب حکمت و دانش کی اصطلاح میں اس اکائی کے امتیازی خدوخال ہی روح عصر کہلاتے ہیں وہ انسان بہت عمیق اور ذہین انسان ہے جو روحِ عصر کو دریافت کرلے۔ شاہد نقوی کی شاعری روحِ عصر کی دریافت کی شاعری ہے۔ جو ان کی ہر تخلیق سے عیاں ہوتی ہے لیکن اس اضافے کے ساتھ کہ وہ روحِ عصر میں بھی ابدی اور آفاقی قدروں کی تلاش میں رہتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

مسلسل ہنس رہا ہوں درد پھر بھی کم نہیں ہوتا
غموں کا مضحکہ شاہد علاج غم نہیں ہوتا

فقط الفاظ سے عہدِ وفا محکم نہیں ہوتا
محبت نام ہے روحوں کے مل کر سانس لینے کا

یا

کسی پر اعتبار اس صاحب محفل کو کیا آئے　　جہاں ہر آنے والا عذر رخصت ڈھونڈتا آئے
نہ ہو مانوس گر چشمِ مسافر حسنِ منزل سے　　تو منزل پر پہنچ کر بھی تجسس کم نہیں ہوتا

یا

اس کی محفل اور محفل میں کوئی اس کا نہیں　　ہائے وہ تنہا جو عرفِ عام میں تنہا نہیں

یا

حیات صرف جنوں ہے نہ صرف ہشیاری　　غنودگی سی ہے مابین خواب و بیداری

شاہد نقوی کے مجموعی تخلیقات کے انبار پر تبصرہ کرنا یا جائزہ لینا ایک بالاستیعاب عمل ہے۔ جس کا میں اس لئے متحمل نہیں ہوں کہ بیشتر تحریریں کثرتِ کار کے سبب ارتجالاً لکھی جاتی ہیں لیکن اگر ان کی فنی اور فکری کاوشوں سے سرسری گزرا جائے تو یہ صریح ناانصافی ہوگی۔ ان مختصر سطروں میں شاہد نقوی کی مذہبی شاعری زیرِ بحث ہے۔ اور یہ بحث اس وقت تک چھڑ نہیں سکتی جب تک کہ اسے مرثیہ نگاری کے تناظر میں نہ دیکھا جائے۔

قدیم مرثیہ نگاروں نے ہر ممکن کوشش کی کہ مرثیہ ادبی صنف رہے خالص مذہبی نظم بن کر نہ رہ جائے ورنہ میر انیس کو کیا ضرورت تھی کہ وہ ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کی کوشش فرمائیں۔ یہی سبب ہے کہ انیس و دبیر کو جہاں بھی موقع ملتا ہے وہاں زمینِ مرثیہ پر شعریت کے پھولوں کی تخم ریزی کرتے ہیں۔ اگر مرثیے کو کربلا یا محمد و حسین تک مخصوص کر دیا جائے اور انہیں میں منحصر کر دیا جائے تو کسی غیر متعلق شخص کو اس میں کوئی کشش محسوس نہ ہوگی۔ لہٰذا متقدمین کو جہاں موقع ملا ہے شاعری کی ہے۔ سراپا، گھوڑا، تلوار، صبح کا سماں، دوپہر کی کیفیت، گرمی کی حالت اور ایسے ہی دیگر مباحث پوری جزئیات کے ساتھ نظم کیے گئے ہیں۔ شعرائے متقدمین کے فوراً بعد کے شعراء نے ساقی نامے کا بھی اضافہ کیا ہے جب کہ براہِ راست مرثیے کے اصل موضوع سے اس کا رابطہ تلاش کرنا مشکل بلکہ محال ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ مرثیہ کا حلقۂ مطالعہ اور دائرہ سماعت وسیع ہو اور اس کی افادیت میں اضافہ ہو۔

مجھے خوشی ہے کہ آج کے دور میں مرثیے کو بڑے طاقتور، ژرف نگاہ اور پڑھے لکھے شعراء ملے ہیں

لیکن مجھے افسوس ہے کہ مرثیہ جو ہیئت اور موضوع کا مواج شعری سمندر تھا اسے مخصوص مذہبی موضوعات کی تنگنائے بنا دیا گیا ہے۔ جس کے سبب اس کی حیثیت شعری مجروح ہوئی اور وہ منظوم مقالہ بن گیا۔ اس تقصیر میں شاہد نقوی شریکِ قوی ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے بڑی چابکدستی سے یہ کام کیا ہے کہ اپنے مراثی میں بعض چہرے ایسے نظم کئے ہیں جن کا تعلق عام انسانی زندگی سے ہے۔ اور بلا تفریق مذہب وملت ایک عام قاری کے لئے جذب وکشش رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود شعریت کی کمی کا احساس برقرار رہتا ہے اگرچہ مذکورہ مقامات پر خال خال وعمدہ اور مناسب شعری پیرایۂ اظہار بھی نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس ان کے قصائد شعریت کا بھرپور نمونہ ہیں ایسی شعریت جن میں جدیدیت بھی ہے اور معنویت بھی۔ فلاسفہ شرق وغرب کے افکار پڑھے جا سکتے ہیں۔ انہیں کھنگالا اور نچوڑا جا سکتا ہے۔ انہیں سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ فارابی اور ابن سینا کو سمجھا جا سکتا ہے۔ میر باقر داماد اور صدر الدین شیرازی جیسے مشکل ایجاد حکماء کی نکتہ آفرینیوں سے لطف اٹھایا جا سکتا ہے لیکن زمین آج کی بہت سی ابہام زدہ، علامت خوردہ اور اغلاق پرورش شاعری کے فہم سے قاصر ہے۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ وہ بہت سی شاعری مہمل ہے بلکہ یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ اگر شاعری سے کسی قسم کا ابلاغ مقصود ہے تو جدید شاعری کا معتدبہ حصہ اس ابلاغی عمل سے محروم ہے۔ شعری جدیدیت صرف نئی ترکیبوں کے ایجاد کر دینے کا نام نہیں ہے۔ جدیدیت بے معنی تحریر کا عمل نہیں بلکہ شعری جدیدیت اپنے عہد کے تازہ بہ تازہ مسائل پر بات کرنے کا نام ہے۔ جدیدیت سائنس اور ٹیکنالوجی کی حیرت ناک ارتقاء سے پیدا ہونے والی انسانی الجھنوں پر بات کرنے کا نام ہے خواہ وہ الجھنیں نفسیاتی ہوں، معاشرتی ہوں یا معاشیاتی ہوں یا کچھ اور۔ اس اعتبار سے شاہد نقوی کی شاعری ہر زاویئے سے جدید شاعری ہے۔ وہ ہیئت کے برتنے میں انتہائی روایت پسند ہیں اور قدامت پرست ہیں۔ لیکن موضوعات کی تلاش اور پیشکش میں انتہائی جدید ہیں۔

قصیدہ آج کے عہد میں ایک متروک صنفِ سخن ہے پچھلے زمانوں میں مذہبی عقیدت رکھنے والے شاعروں نے دولتِ عقبیٰ کی خاطر اپنے ممدوحین کے لئے اور درباری شعراء نے دولتِ دنیا کی خاطر اپنے بادشاہوں اور دیگر اکابر کے لئے قصیدے لکھے تھے۔ آج جب کہ مذہبی گرفت کمزور اور شاہان و اکابر کی صف تقریباً مفقود ہو چکی ہے۔ قصیدے کی اہمیت بھی ختم ہو چکی ہے۔ لیکن قصیدوں کے زمانہ

عروج سے آج کے دورِ انحطاط تک اس طویل عرصے میں وہ لوگ بہر حال موجود رہے ہیں جو محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام کی دہلیزِ علم و طہارت پر زندگی گزارنا اپنا مقصدِ تخلیق سمجھے رہے ہیں یہی سبب ہے کہ اپنے زمانوں میں محشر اور عزیز نے نظم طباطبائی اور نجم آفندی نے، والد مرحوم مولانا محمد مصطفےٰ جوہر، حضرت جمیل مظہری اور پروفیسر اجتبیٰ رضوی زیبا ردولوی وغیرہم نے اس صنفِ سخن کو طاقِ نسیاں سے نکال کر جھاڑا پونچھا اور اپنے اپنے مزاج کے مطابق صیقل کی۔

آج کے تیز رفتار اور اختصار پسند دور میں شعراء نے نعت و منقبت کو قصیدہ کا نعم البدل قرار دے لیا ہے۔ شاہد نقوی کو اس صنفِ سخن سے کیا دلچسپی ہے مجھے نہیں معلوم لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ جس طرح بعض شعراء نے غزل کو سلام سے بدل لیا تھا اسی طرح شاہد نقوی نے اپنے فطری نظم گوئی کے سارے جذبوں کو قصیدے کا پیرہن پہنا دیا ہے۔

قدیم قصائد اس بات کے آئینہ دار ہیں کہ تشبیب اور مدح میں کوئی ربط نہیں ہوتا۔ اور گریز کے ذریعے ان میں ربط پیدا کیا جاتا ہے۔ شاہد نقوی نے شعوری طور پر قصائد کی ایسی تشبیبیں تحریر کی ہیں جن میں تشبیب اور مدح مربوط بلکہ گتھی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس صنفِ سخن کا احیاء اور اس کی آسائش و زیبائش شاہد نقوی کا وہ مخصوص ادبی پہلو ہے جس میں وہ بہت حد تک منفرد نظر آتے ہیں البتہ میں ان کے قصائد میں فن کا ایک اہم جزو دعا نہیں پاتا۔

ان چند سطروں کا یہ مفہوم نہیں کہ ان کا سارا تخلیقی عمل قصیدہ گوئی میں منحصر ہے۔ انہوں نے حمد و نعت و منقبت میں اپنی عقیدت اور اس سے زیادہ اپنی پختگی کے پھول کھلائے ہیں۔ لیکن قصیدہ چونکہ ان کے گلزارِ فن میں ایک قد آور سرو کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس کی الگ نشان دہی کی گئی ہے۔

طالب جوہری

☆☆☆☆☆

کتاب۔ نقطۂ اعتدال

شاعر۔ منظور حسین یاد

سنِ اشاعت: ۱۹۹۳

# دیباچہ

## علامہ طالب جوہری

انسان اپنی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں جب دوسرے انسان سے ملتا ہوگا تو گفتگو کے آغاز کے لئے یقیناً کچھ استقبالیہ کلمات بھی کہتا ہوگا۔ یہ یقینی احتمال اس بنیاد پر ہے کہ آج دو افراد کی ملاقات پر جو استقبالیہ کلمات کہے جاتے ہیں۔ وہ دنیا کی تقریباً ہر زبان میں رائج ہیں۔ ان میں بیشتر دعائیہ ہوتے ہیں جیسے عربی میں "صبحک اللہ بالخیر" (اللہ تمہاری صبح بخیر کرے) مساک اللہ بالخیر (اللہ تمہاری شام بخیر کرے)، یہی جملے بعض دوسری زبانوں (فارسی، انگریزی وغیرہ) میں ملتے جلتے مفہوم کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ ہندو تہذیب کا نمستے اور پرنام یا سکھ تہذیب میں واہگورو کا تذکرہ اسی عمل کے مختلف رُخ ہیں۔

اسلام نے ان سارے دعائیہ اور عقیدت مندانہ کلمات کے مقابل ایک نئی راہ متعین کی اور وہ یہ ہے کہ جب انسان ایک دوسرے سے ملیں تو سلام کریں اور اس میں بھی یہ نزاکت رکھی کہ ابتداءً سلام کرنے کو مستحب اور جواب سلام کو واجب قرار دیا۔ یہ سلام درحقیقت دو انسانوں کے درمیان سلامتی کا معاہدہ ہے اور وہ یوں کہ دونوں ایک دوسرے سے یہ عہد کریں کہ تم میری طرف سے سلامتی میں ہو، یعنی میری طرف سے تمہیں کوئی نقصان یا ضرر نہیں پہنچے گا۔

اسلام میں یہ سلام اتنا اہم ہے کہ نماز کا اختتام اسی پر کیا گیا ہے۔ اس سلام کے علاوہ رسول اکرمؐ، بنت رسولؐ اور ائمہ کرامؑ کے سلسلے میں مختلف زیارتوں کا رواج رہا ہے جو السلام علیک سے شروع ہوتی ہیں۔ یعنی انسان اپنے صمیم قلب کے ساتھ ان کی خدمت میں یوں عرض پرداز ہوتا ہے کہ میں آپ کو ضرر نہیں پہنچاؤں گا اور آپ میری طرف سے مکمل سلامتی میں ہیں، جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ہے، کہ جواب سلام واجب ہے تو اگر ان بارگاہوں سے جواب میں سلامتی عطا ہو جائے تو اس سے زیادہ انسان کو اور کیا

چاہیئے؟ قبورِ محمدؐ و آلِ محمدؐ علیہم السلام کی زیارات کا فلسفہ بھی یہی ہے۔

اس صفِ برگزیدگان میں سید الشہداءؑ کی ذاتِ گرامی اس لحاظ سے بہت منفرد ہے کہ سب سے زیادہ سلام انہی کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپؑ نے روز عاشورہ سید سجاد کو جو وصیتیں فرمائی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ میرے چاہنے والوں کو میرا سلام پہنچا دینا، چونکہ جوابِ سلام واجب ہے۔ لہٰذا ہر چاہنے والا یہ کوشش کرے کرتا ہے کہ مسلسل جوابِ سلام دیتا رہے۔

جن لوگوں نے اس فلسفہ کو سمجھ لیا انہوں نے نمازوں کے بعد، مجالس کے اختتام پر اور اپنے روز مرہ کے دیگر مراحل پر اسے اپنا وطیرہ اور شعار قرار دے لیا اور مخصوص و مروی زیارتیں پڑھتے رہے۔

شعراء اپنے نہجِ فکر اور سلیقۂ اظہارِ جذبات میں ہمیشہ عام روش سے ہٹ کر چلنے کے عادی رہے ہیں، انہوں نے اپنی اپنی زبانوں میں اسی کے زیرِ اثر سلام نظم کیے ہیں۔ فی الوقت چونکہ گفتگو اُردو زبان کے حوالے سے ہو رہی ہے۔ اس لیے ہمیں تلاش کرنا ہوگا کہ وہ پہلا شاعر کون ہے جس نے سلام نظم کیا! یا کم از کم وہ کون سا عہد ہے جب سلام نویسی کا آغاز ہوا! پہلے سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے لیکن دوسرے سوال کے سلسلے میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ایک مجموعۂ سلام کے دیباچے میں یہ تحریر کیا تھا کہ اُردو زبان میں سلام درحقیقت مرثیہ کی ایک ذیلی صنف رہی ہے جو رباعی کی طرح مجلس جمانے کے لئے مرثیہ سے قبل استعمال کی جاتی تھی۔ یہ بات اُس عہد پر تو یقیناً صادق آتی ہے جس عہد میں سلام کی حیثیت متعین ہو چکی تھی اور مرثیہ سے الگ اس کا اپنا ایک تشخص پیدا ہو چکا تھا، لیکن یہ بات اُس عہد کے لئے یقیناً نادرست ہے، جب زمینِ اُردو پر سلام اور مرثیہ کی تخم ریزی ہو رہی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب نہ یہ اصناف معرضِ وجود میں آئی تھیں اور نہ ان کے فنی نام منصۂ شہود پر تھے۔ اگر کچھ تھا تو صرف یہ تھا کہ شاعر اپنے سلام کو شعری سانچوں میں ڈھال لیا کرتا تھا جیسا کہ گیارہویں صدی ہجری کے ایک شاعر مرزاؔ بیجاپوری کے سلام سے واضح ہوتا ہے۔

اے شہِ کربلا سلام علیک — افضلِ اولیاء سلام علیک
توں ہے برحق امام دو جگ کا — رہبر و رہنما سلام علیک
جد ہے تیرا محمدؐ مرسل — سرورِ انبیاء سلام علیک

فاطمہؓ ہور علی کی دریا کا! | توں دُر بے بہا سلام علیک
سرور دیں حسن کا توں بازو | اے دو جگ پیشوا سلام علیک
جیوں دیا حق تجھے شرف عالی | یوں کسے نیں دیا سلام علیک
ہے ترے ناؤں پر جتم مرزاںؔ | جان و دل سوں فدا سلام علیک

یہ اور ایسے ہی چند سلاموں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرثیہ کے برگ و بار سلام ہی کے تخم سے نکلے ہیں۔ یعنی میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ مرثیہ اور سلام (بلکہ ان کے ساتھ نوحہ بھی) ہیئت اور نام کی تعیین کے بغیر ایک ساتھ وجود میں آئے ہیں جو مثنوی، غزل، قطعہ بند مربع مخمس اور مثمن و مسدس کی شکلوں میں لکھے جاتے رہے انہیں کبھی نمازوں کے بعد بطور وظیفہ پڑھا جاتا تھا، کبھی اختتامِ مجلس پر نوحہ کی صورت میں اور کبھی روزِ عاشورہ وغیرہ کے جلوسوں میں۔ غالباً تیرہویں صدی ہجری کے آغاز پر ضرورتِ مجلس کے تحت جب یہ عزائی اور رثائی ادب نسبتہً طویل تر لکھا جانے لگا تو اس وقت مرثیہ اور سلام میں تفریق ہوئی۔ ابھی عرض کیا گیا کہ رثائی ادب کی اس مذکورہ وحدت میں نوحہ بھی شامل تھا۔ قلی قطب شاہ جسے بہت سے محققین اردو کا پہلا مرثیہ گو شاعر قرار دیتے ہیں۔ اس کے کلام میں نوحہ کی بھی جھلکیاں ملتی ہیں، جیسا کہ اس شعر سے واضح ہوتا ہے۔

محرم مہینے میں آیا اماماں کا سو غم پھر کر
زمین ہور آسمان میانے بھریا سر تے الم پھر کر

مذکورہ تینوں اصناف کے سلسلے میں یہ نظریہ اس لئے قائم کیا گیا کہ کسی بھی صنف کی ہیئت شعوری طور پر یک لخت متعین نہیں ہوتی بلکہ صدیوں کے عمل کے بعد اس کے خط و خال واضح ہوتے ہیں۔

تیرہویں صدی ہجری ہی کے آغاز سے اردو کے رثائی ادب میں صنادید وا کابر پیدا ہونے شروع ہوئے اور انہوں نے سلام و مرثیہ کی ہیئت معین کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے موضوعات کو بھی وسعت بخشی اور اسی عہد میں سلام نے شعراء سے اپنی الگ اور مستقل بالذات حیثیت تسلیم کروا لی (۱)۔ اپنی حیثیت کو تسلیم کروا لینے کے باوجود سلام اپنے لغوی مفہوم ہی میں برتا جاتا رہا، جیسا کہ مندرجہ ذیل مثالوں سے واضح ہوتا ہے۔ ولی اورنگ آبادی کے سلام کے دو شعر یہ ہیں۔

(۱)۔ یہ ارتجالاً لکھی ہوئی سطریں اس بات کی متقاضی نہیں ہیں کہ کوئی تفصیلی گفتگو کی جائے ورنہ سخن ہائے گفتنی بہت تھی۔

اس نور مصطفےٰ پر بولو سلام یاراں　　محبوب مرتضیٰ پر بولا سلام یاراں
اس پاک باصفا پر حیدر کے دلربا پر　　اس لعل بے بہا پر بولو سلام یاراں

میرؔ عبداللہ مسکین نے آٹھ اشعار پر مشتمل جو سلام کہا ہے اس کا پہلا شعر یہ ہے۔

اے بادِ صبا جا کے عدن میں تو گزر کر　　کہہ جا کے سلام اس کو جو ہے ختمِ پیمبر

اس سلام میں دوسرا مصرع مکرر آتا رہا ہے اور قافیہ میں ختم پیغمبر کی جگہ ساقی کوثر، نورِ پیمبر، حضرت شبر، حضرت اکبر، حضرت اصغر، عباس دلاور اور قاسم بے پر، نظم کیا گیا ہے۔

سوداؔ کے سلام کا مطلع ہے۔

اے محمدؐ کی دو عالم میں نشانی السلام　　اے امام رہنما حیدر کے ثانی السلام

میرؔ کے سلام کا مطلع یہ ہے۔

اے بدخشانِ نبی کے لعل احمر السلام　　اے گلستان علی کے بادۂ تر السلام

اس طریقے کے سلام اب بھی لکھے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت وہی ہے جو کسی عصر میں غیر معاصر شے کے وجود کی ہو سکتی ہے۔

پچھلی صدیوں میں واقعۂ کربلا ایک سانحہ تھا جسے سیدھے سادھے بیانیہ انداز میں نظم کر دیا جاتا تھا، لیکن گذشتہ ایک صدی سے یہی واقعۂ کربلا ایک تاریخ ہے، ایک تہذیب ہے، ایک انقلاب کا درس ہے اور ایک ادارۂ تربیتِ فکر ہے، فکری رویّوں کے ارتقاء نے اس حقیقت کو مجاز بنا دیا کہ کربلا ملکِ عراق کا ایک شہر ہے، اور اس مجاز کو حقیقتِ ابدی بنا دیا کہ کربلا ہر اس اعلانِ حق کا نام ہے جو کسی بھی باطل کے خلاف کیا جائے گا۔ اگر اصولِ فقہ کے علماء کے نزدیک حقیقتِ شرعیہ مستند ہو تو کوئی سبب نہیں ہے کہ علمائے ادب کی نگاہ میں یہ حقیقتِ شعریہ مستند نہ ہو۔ مفہومِ کربلا کی اس وسعت پذیری نے سلاموں کو نئے آفاق و جہات سے روشناس کرایا، یہی سبب ہے کہ اس صدی کے سلاموں میں کردار نویسی، بین نگاری اور فضائل نگاری کے ساتھ ساتھ ان سارے موضوعات پر گفتگو ملتی ہے، جن کا تعلق انسانیت سے ہے۔

بہت عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا ہے کہ سلاموں میں ایسے الفاظ رکھے جائیں جو ان کی شناخت کا سبب بن سکیں۔ جیسے مجرئی اور سلامی کے الفاظ۔

انیسؔ — حسین یوں ہوئے اے ہجریٔ وطن سے جدا
کہ جیسے بلبل ناشاد ہو چمن سے جدا!

دبیرؔ — اس کو بجرا ہے وطن میں جسے جانا نہ دیا
سر جو سجدے میں تھا قاتل نے اٹھانے نہ دیا

تعشقؔ — سلامی جس نے مزار شہِ شہاں دیکھا
گل مراد کھلا گلشن جناں دیکھا

فصیحؔ — میں سلامی چار اماموں کا مدینے میں ہوا
چار پارہ لالہ ساں دل غم سے سینے میں ہوا

یہ چند اشعار بہ طور نمونہ درج کئے گئے ورنہ دلگیر کے عہد سے لے کر عشق و تعشق سے ہوتے ہوئے انس و مونس بلکہ ان کے بعد تک یہ الفاظ سلاموں میں نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی ایسا التزام نہ تھا جس کے بغیر سلام سلام نہ رہ سکے، انیس و دبیر اور سارے مذکورہ بالا شعراء کے یہاں ایسے بہت سے سلام ملیں گے، جن میں یہ الفاظ استعمال نہیں ہوئے اور رفتہ رفتہ شعرائے متاخرین نے اسے متروک قرار دے دیا۔ اس کا سبب جو بھی رہا ہو، لیکن اتنی بات طے ہے کہ جب سلام کو اپنی پہچان کے لئے ان الفاظ کے سہاروں کی ضرورت نہ رہی تو انہیں ترک کر دیا گیا۔

غزل کے معنی عورتوں سے بات کرنے کے ہیں لیکن اصطلاحاً یہ لفظ اپنی مفہوم لغوی سے ہٹ چکا ہے اور میرؔ و غالبؔ کے عہد سے لے کر آج تک اس میں اتنی وسعتیں پیدا ہوئی ہیں کہ دنیا کا ہر مضمون بلا تکلف اس صنف میں نظم کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سلام کے اصطلاحی مفہوم میں وہ وسعت پیدا ہوئی کہ اس میں ہر وہ شائستہ اور مہذب فکر جسے یہ صنف برداشت کر سکے نظم کی جا سکتی ہے۔ میر انیسؔ اور ان کے خانوادہ کے شعراء نے موت، قبر، بے ثباتی دنیا، توکل، قناعت، پیری و شباب جیسے مضامین کو سلاموں میں نظم کیا ہے اور یہی روش کم و بیش اس عہد کے سلام گو شعراء کی رہی ہے۔ اس مقام پر میں پھر اپنی ہی تحریر کردہ ایک بات کو دہرانا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ خصوصیت کے ساتھ انیسؔ کے بعض سلام ایسے ہیں کہ اگر ان میں رثائیہ اور عزائیہ اشعار نکال لئے جائیں تو حکمت و اخلاق اور حیات

فنی کے مضامینِ عالیہ سے بھرپور غزلیں اپنی پوری رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے چند سلاموں کے مصرع ہائے اولین حسبِ ذیل ہیں۔

مرا راز دل آشکارا نہیں!

لحد میں سامنے جب دفترِ حساب آیا

زرد ہے چہرہ نحیف و زار ہوں

نمود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں

موجودہ سلام کے صورت اور معنوی عناصر کی دریافت کے لئے ہمیں چند دوسری اصنافِ سخن کا جائزہ لینا پڑے گا۔ رسولِ اکرمؐ کی مدح کو نعت، آلِ محمدؐ کی مدح کو منقبت اور کربلا سے متعلق بینیہ اشعار کو نوحہ کہا جاتا ہے (اگرچہ نوحہ کی حیثیت نجم آفندی اور فضل لکھنوی تک آتے آتے نفسیاتی اور عمرانی تجزیہ و تحلیل سے ہمکنار ہو گئی۔ لیکن اس کی اصل روح پھر بھی باقی رہی)۔ مذکورہ تینوں اصناف کی ہیئت موجودہ دور میں کم و بیش غزل ہی کی ہیئت ہے۔ اس لحاظ سے سلام کے عناصر اربعہ نعت، منقبت، نوحہ اور غزل کے مضامینِ عالیہ پر مشتمل ہیں۔ غزل کے مضامینِ عالیہ سے مراد ہے کہ جن دقیق، عمیق، فلسفیانہ، صوفیانہ تجربات اور نفسیاتی مضامین کے بوجھ سے غزل کی کمر جھک جاتی ہے۔ انہیں بآسانی سلام کے مضبوط کندھوں پر رکھا جا سکتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے مذکورہ بالا معروضات سے سلام کے تعارف کا حق ادا ہوا یا نہیں؟ لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ اگر میں اس مقام پر ایک شاعر کے ایک سلام کا تذکرہ نہ کروں تو خود مجھے اپنی اس خطائے اجتہادی پر زندگی بھر پشیمانی رہے گی۔ یہ وہ شاعر ہے جس نے زندگی میں غالباً صرف ایک ہی سلام لکھا۔ ایسا سلام کہ آج کا ہر سلام اور ہر مرثیہ اس کی فکر انگیزیوں کی بازگشت محسوس ہوتا ہے۔

سلام اسے کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو

نہ بادشاہ نہ سلطاں یہ کیا ستائش ہے
کہو کہ خامسِ آلِ عبا کہیں اس کو!

خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی
کہو کہ رہبر راہ خدا کہیں اس کو

غالب دل خستہ کے اس سلام میں وہ سب کچھ ہے جس کی اساس پر آج کے رثائی ادب کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ میرے اس دعوے کی سچائی کو پرکھنے کے لئے پورے سلام کا سنجیدہ مطالعہ کیا جائے اور پھر نفی و اثبات کا حکم لگایا جائے۔ یہ حکایت اگرچہ لذیذ ہے اور دراز تر ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک مختصر سا مقدمہ اس کا متقاضی ہے۔

مختلف شعراء کے سلاموں کی یک جا جمع آوری کا عمل کس حد تک اپنے شیدائی پیدا کر سکا ہے۔ مجھے نہیں معلوم، البتہ میری نظر قاصر سے جو مجموعے گزرے ہیں وہ فقط دو ہیں۔

(۱)۔ مجموعہ سلامہائے متقدمین و متاخرین مرتبہ سید عنایت حسین حسؔین۔

یہ مجموعہ بہ ترتیب حروف تہجی مرتب کیا گیا ہے اور پانچ سو صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے۔

(۲)۔ حسین پر سلام۔ مرتبہ سید علی رضوی۔

یہ مجموعہ مختلف ادوار شاعری کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے اور ساڑھے تین سو صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے۔

میں نے ابھی عرض کیا کہ میری نظر قاصر ہے اور اس میدان میں میرا مطالعہ بہت ناقص ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شعراء کے وہ مجموعے جو فقط سلاموں میں سے مخصوص ہوں۔ معتدبہ تعداد میں ہوں، لیکن میری نظر سے جن شعراء کے مجموعے گزرے ہیں وہ یہ ہیں۔ انیسؔ، دبیرؔ، علی میاں کاملؔ، محمد مصطفےٰ جوہرؔ، میر مہدی علی شہیدؔ، یکتا امروہی، ثاقب مظفر پوری، تصویر فاطمہ رضوی اور مشکور حسین یادؔ۔

چند سال قبل مشکور حسین یادؔ کا مجموعہ سلام ''مفہوم زمانہ'' طبع ہو کر علم دوست اور ادب پرور حلقوں سے اپنے وقیع ہونے کا اعتراف کروا چکا ہے اور اب زیر نظر مجموعہ ''نقطۂ اعتدال'' ارباب ذوق و آگہی کی خدمت میں حاضر ہے۔ یہ دونوں مجموعے اس شخص کے ہیں، جس کی شناخت کا عنوان ابھی تک طے نہیں ہو سکا ہے۔ مشکور حسین یادؔ ایک ہی وقت میں اپنی شناخت کے مختلف وسائل سے مالا مال ہیں۔ وہ ایک تجربہ کار ماہر تعلیم ہیں۔ سنجیدہ انشائیہ نویس ہیں، مزاحیہ نثر نگار ہیں۔ مزاحیہ شاعر ہیں، ملی، قومی اور

بین الاقوامی نظموں کے خالق ہیں اوراس پر مزید یہ کہ دیگر اصناف شعر کے علاوہ سلام بھی لکھتے ہیں۔اور یہ بات مستقبل بعید میں طے ہوگی کہ ان سارے شعبوں میں سے کون سا شعبہ امتیازی طور پر ان کی شناخت قرار پاتا ہے۔اس لئے کہ مذکورہ سارے میدانوں میں ان کا سفر ابھی جاری ہے۔

انسان کو اپنے نفس پر جتنی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔اتنی کسی اور کو نہیں ہوتی،وہ اپنے آپ کو دوسروں کی نسبت بہت جلد اور بہت اچھی طرح پہچانتا ہے۔وہ اگر زبان ودل کی مکمل ہم آہنگی کے ساتھ اپنی شناخت کرادے تو وہی شناخت مستند ہوگی۔لیکن شرط یہ ہے کہ وہ جو کہہ رہا ہواس پر یقین بھی رکھتا ہو۔کون نہیں جانتا کہ غالب نے پیشۂ آبا،کو اپنی شناخت قرار دیا تھا،لیکن انہیں جو عزت نصیب ہوئی اس کا سبب شاعری ہے،سپہ گری نہیں ہے۔اس لئے کہ وہ زندگی بھر وہی کرتے رہے جسے ذریعہ عزت نہیں سمجھتے تھے۔اس کے برخلاف جب کسی فاتح جنگ جو سے اس کا شجرۂ نسب دریافت کیا گیا تو اس نے موقع کی نزاکت اور چھپے ہوئے طنز کو بھانپ لیا اور جواب میں وہی کہا جو اسے کہنا چاہیے تھا۔یعنی شمشیر ابن شمشیر۔

مظفر حسین یاد نے اپنی شناخت کے اظہار کے لئے اپنے تمام علمی مشغلوں میں سے کسی ایک کو بھی منتخب نہیں کیا۔بلکہ انہوں نے وہی کہا جسے انہوں نے کہنا چاہیے تھا،اور جس پر ان کا یقین تھا،عموماً لوگ اپنے حسب ونسب یا اپنے علم وفضل یا اپنے سلیقۂ زندگی (جینے کا ڈھب) کو اپنی شناخت قرار دیتے ہیں۔یہی عامیانہ روش پروفیسر مظفر نے بھی اپنائی ہے اور انہیں تینوں چیزوں پر ناز کیا ہے۔ایسی عامیانہ روش جس پر دنیا کی ساری انفرادیتیں قربان ہو جائیں۔انہوں نے اپنے حسب ونسب کا اعلان اس شان کے ساتھ کیا ہے۔

کہتے ہیں جسے حُبِّ علی شجرۂ ہر علم!
دراصل حسب اور نسب ہے وہی اپنا

اپنے علم وفضل پر یوں گفتگو کی ہے۔

ہم کیسے نہ دیں نفسِ پیمبر کا حوالہ
تاریخ ہے، منطق ہے، ادب ہے وہی اپنا

اوراپنے سلیقۂ زندگی کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں۔

آنکھوں میں علیؑ، دل میں علیؑ، جاں میں علیؑ ہے
جینے کے قرینے کا سبب ہے وہی اپنا

اب رہا یہ سوال کہ انہیں خود اپنے دعووں پر یقین ہے یا نہیں؟ تو اسی سلام کے پانچویں اور نو شعر کے مصرع ہائے ثانی اس کے گواہ ہیں جو بالترتیب یہ ہیں۔

ع ایمان، تمنا و طلب ہے وہی اپنا

ع صد شکر یقین جد و اب ہے وہی اپنا

مشکور حسین یاد اگر اپنے سلاموں کو سلاموں کے نام سے یاد نہ کرتے تو ان کے لئے کوئی اصطلاح وضع کرنی پڑتی، اس لئے کہ بہت سے ایسے سلام ہیں جو رثاء اور عزا سے یکسر خالی ہیں اور نعت و منقبت سے قریب ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی شعر گوئی کا منشور خود انہی کا ایک شعر ہے

بصیرتوں کی زرہ بھی زیبِ اہلِ عزا ہے
نہ صرف درد و الم کا لبادہ رکھتے ہیں! (مفہومِ زمانہ)

لہٰذا ان کا یہ عمل بھی ان کی انفرادیت پسندی قرار پائے گا۔ یعنی اہلِ عزا کی طرح ان کے سلاموں کے اشعار بھی صرف درد و الم کا لبادہ نہیں اوڑھتے بلکہ بصیرتوں کی زرہ بھی پہنتے ہیں اور چونکہ یہ قرن فکری نبرد آزمائیوں کا قرن ہے اس لئے لبادہ کے مقابل زرہ کی افادیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ اس بات پروفیسر مشکور نے شعوری طور پر محسوس کیا ہے اور برتا ہے اسی لئے وہ درد و الم کے لبادے پر بصیرتوں کی زرہ کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنے سلاموں میں بیشتر ایسے اشعار لکھتے ہیں جو بصیرتوں کو جلا دے سکیں، لیکن اُس کے باوجود ان کے فن سلام گوئی کی پہلی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت سے مقامات پر اپنے اشعار کو دونوں پوشاکیں پہننے پر مجبور کردیتے ہیں۔ یعنی درد و الم کا لبادہ بھی اور بصیرتوں کی زرہ بھی۔ جس کی بہترین مثال یہ شعر ہیں۔

آنکھیں بھگوئیے شفقِ اشک سے
نوکِ مژہ پہ نور کے طوفاں اُٹھائیے (نقطۂ اعتدال)

جب تک وہ نہ اپنائے گا شبیرؑ کے غم کو
انسان غمِ زیست کی ابجد میں رہے گا! (مفہومِ زمانہ)

دوسری خصوصیت وہ رجائیت ہے اور امامِ عصر علیہ السلام کے حوالے سے اس صبحِ نو کا انتظار ہے جو انسانی صلاح وفلاح کی ضامن ہے۔ رجائیت کی یہ فضا پورے مجموعۂ کلام پر محیط ہے۔

تیسری خصوصیت وہ سنجیدہ سرخوشی وطرب انگیزی ہے جو دین کے حوالے سے شعر میں پیدا کی جاتی ہے۔ یہ کیفیت بھی پورے مجموعہ سے نمایاں ہے۔ لیکن اس کی اعلیٰ ترین نمائندگی اس سلام سے ہوتی ہے۔ جس کی ردیف ہے "علی علی کر" یا پھر یہ شعر

ہاں ہم ہیں غلامان گدایان درِ علم
اس فخر کی تو داد لئے بن نہ رہا جائے

ان کے کلام میں ایک ایسا امتیاز بھی ہے جو شعوری یا غیر شعوری طور پر اساتذۂ متقدمین کے ایک مخصوص اسلوب کی کامیاب پیروی ہے۔ میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ انیس کے سلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ رثائی اشعار کو نکالنے کے بعد وہ ایک مخصوص مزاج کی غزل بن جاتا ہے۔ یہ خصوصیت دوسرے اساتذہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس کی ایک اچھی مثال سلیس کے سلام کے یہ اشعار ہیں۔

چل گیا نقشِ قلم ایسا عدم کے دیس میں
پھرتے ہیں مٹی کے پتلے آدمی کے بھیس میں

کوئی دنیا میں نہیں انساں سے بھی نازک سوا
رشتۂ جاں ٹوٹ جاتا ہے ذرا سی ٹھیس میں

کیوں نہ غربت میں کرے انسان اپنے گھر کو یاد
جانور بھی ڈھونڈتا ہے آشیاں پردیس میں

کل جو مجھ سے بھاگتے تھے صورتِ عمرِ رواں
آج میں خود ان سے مل آیا گدا کے بھیس میں

زندگی کب تک ہے اس عالم میں کیا جانے سلیقؔ
موت اپنی آئے گی کس وقت اور کس دیس میں

بعینہٖ اسی طرح مشکور صاحب کے بعض سلام ایسے ہیں کہ اگر ان میں سے سلام کے اشعار نکال لئے جائیں تو ایک مخصوص لب ولہجہ کی تیکھی سے غزل برآمد ہو جائے گی "مفہوم زمانہ" کے یہ چند شعر اس کے گواہ ہیں۔

| | |
|---|---|
| ہمیں ملتی ہے خوابوں کی نئی جاگیر ہر لحظہ | ہماری زندگی ہے اک نئی تعبیر ہر لحظہ |
| سُنی ہی ان سنی کر دیں تو ہے یہ بات الگ ورنہ | بلاتا ہے کوئی انصاف کی زنجیر ہر لحظہ |
| فرشتے ہی نہیں اپنا دل کافر بھی کرتا ہے | ہمارے نامۂ اعمال کو تحریر ہر لحظہ |
| ہم اپنے آپ کو کیسے چھپائیں کس جگہ جائیں | اُتر جاتی ہو جب ہر فکر کی تصویر ہر لحظہ |

مشکور صاحب کے سلاموں میں ایسے اشعار کی تعداد کم نہیں ہے۔ یہ مجموعہ جس کا نام نقطۂ اعتدال ہے ایک ایسا مجموعۂ سلام ہے جسے نہ زندہ رہنے کے لئے مصنوعی تنفس کی ضرورت ہے اور نہ چلنے کے لئے کسی بیساکھی کی حاجت ہے یہ اپنی ذات میں خود اتنا طاقتور ہے کہ اسے اپنا مقام متعین کروانے میں دشواری نہیں ہوگی۔ اس لئے اس میں شاعر نے مواد کے اعتبار سے اپنے جذب و خلوص اور علم و آگہی کی بہترین عکاسی کی ہے، اور ہیئت کے اعتبار سے استادی کے جوہر دکھلائے ہیں۔ دونوں مجموعوں کو سامنے رکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کو اساتذہ کی زمینوں میں طبع آزمائی کا سنجیدہ شوق ہے اور مشکل ردیفوں میں اپنی طبیعت کی جولانی کے اظہار کا شائستہ ذوق بھی جیسے نہ اپنایا ہوا ہو، اب ہے وہی اپنا، بچے بن نہ رہا جائے وغیرہ وغیرہ۔ اب آپ نقطۂ اعتدال کو خود ملاحظہ فرمایئے۔

طالب جوہری

۱۹ نومبر ۱۹۹۰ء، کراچی

☆☆☆☆☆

کتاب۔ لواء الحمد

شاعر۔ مولانا حسن امداد

سن اشاعت: ۱۹۹۳

## از رشحہ قلم حجۃ الاسلام حضرت علامہ طالب جوہری مدظلہ العالی

میں ایک طویل مدت سے مولانا سید حسن امداد غازی پوری دام اللہ ظلہ کا کلام مختلف محافل و مجالس میں سنتا رہا ہوں اور بلا مبالغہ ہر مرتبہ ان کے کلام کی بھرپور شعریت اور موسیقیت پر میرے ایمان و ایقان میں اضافہ ہوتا رہا ہے اور آج ان کے کلام پر چند سطریں تحریر کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

مولانا سید حسن امداد جامعہ ناظمیہ لکھنؤ کے فارغ التحصیل اور علوم شرقیہ کے ماہرین میں ہیں۔ اس قحط الرجال کے زمانے میں جن چند مستند صاحبانِ فضل کا نام لیا جاسکتا ہے اُن میں آپ کا اسمِ گرامی بھی شامل ہے۔ علل الشرائع اور بحار الانوار کے بعض مجلدات کے تراجم آپ کی علمی صلاحیتوں کے آئینہ دار ہیں۔ یہ تعارفی سطریں اس لئے ناگزیر تھیں کہ مولانا کے شعری مجموعہ کی پوری فضا عربی شاعری کا ایک لطیف پرتو ہے۔

جب بھی شاعری اور اس کے متعلقات پر بات نکلتی ہے تو دو سوالات پوری توانائی کے ساتھ ذہن پر حملہ آور ہوتے ہیں کہ شاعری کیا ہے؟ اور اسے کس طرح بامعنی بنایا جاسکتا ہے؟ قرآن مجید میں صراحت اور اشارت دونوں طریقوں سے ان کے جوابات مل جاتے ہیں۔ سورۂ یٰسین میں یوں ارشاد ہوا ہے۔ وَمَا علمناہ الشعر وما ینبغی لہ ان ھو الا ذکرو قرآن مبین (۶۹)۔ ہم نے انہیں شعر کی تعلیم نہیں دی اور نہ شعر اُن کے لائق ہے۔ یہ تو صرف ذکر و نصیحت اور قرآن مبین ہے۔ اس آیت سے یہ بات واضح ہے کہ شعر جو کچھ بھی ہے وہ ذکر اور قرآن نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بھی واضح ہے کہ ذکر و قرآن شعر نہیں ہیں۔ اس آیہ مبارکہ کے علاوہ بھی قرآن مجید نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شاعر ہونے کی بعض (۱) مقامات پر تردید فرمائی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مشرکین نے آپؐ کے خلاف جو

الزامات تراشے تھے ان میں ایک شاعر ہونے کا الزام تھا(۲)۔ اب یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر شاعری انسان کے محاسن میں ہے تو رسول اکرمؐ کو اس سے کیوں دور رکھا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جس عہد کی شاعری پر گفتگو کر رہے ہیں اس عہد کے سماج نے اچھے شعر کے سلسلہ میں ایک حتمی فیصلہ دے دیا تھا اور وہ تھا اعذب الشعرا اکذبہ سب سے اچھا اور دلنشین شعر وہ ہے جس میں سب سے بڑ جھوٹ اور مبالغہ نظم کیا گیا ہو۔ یہ جملہ اس عہد کے شعر اور شاعر دونوں پر مکمل ترین تبصرہ ہے اس کی روشنی میں شاعر وہ ہے جو مفروضات، اوہام، تصورات، جذبات اور خیالات سے اپنے لئے اک چمن بناتا ہے اور اس میں خوش رہتا ہے اس کے اشعار کا حقیقت اور واقعیت سے کوئی ربط نہیں ہوتا وہ خیالی دنیا میں رہتا ہے، اپنے اشعار سے بے عملی اور نفسانی جذبات کو ترغیب فراہم کرتا ہے اور اپنے زور شاعری اور قوت ناطقہ کے بل پر رائی کو پربت اور پربت کو رائی بنا دیتا ہے۔ مذکورہ ساری باتیں شاعری میں مبالغہ اور غلط بیانی کے رواج عام اور بے عملی کی تلقین کا سبب بنتی ہیں جب کہ یہی باتیں رسالت کے لئے قبیح ترین، بلکہ اس منصب جلیل کے متناقض ہیں۔

(۱) سورۂ حاقہ ۴۱۔ (۲) سورۂ انبیاء ۵

معلقات سبع عہد نزول قرآن کے وہ قصائد ہیں جو اپنے دور میں سکہ رائج الوقت تھے۔ یہ عہد جاہلیت کا کلام تھا۔ ان میں سب سے پہلا اور سب سے اہم قصیدہ امراء القیس کا ہے۔ مکرر مطالعہ کے باوجود اس میں آیات انفس و آفاق، حکمت و بصیرت، اخلاق و آداب یا جذبات عالیہ کے سلسلے کی کوئی بات نہ ملے گی جو کچھ ملے گا وہ سرخوشی و سرمستی، نشاط و اختلاط اور جسمانی وصل و فصل سے عبارت ہوگا۔ پیغمبر اکرمؐ نے ایک موقع پر امراء القیس کے سلسلے میں ارشاد فرمایا کہ قائد الشعراء الی النار یعنی وہ شعراء جو جہنم میں جانے والے ہیں امراء القیس ان کا سالار قافلہ ہے۔ غالباً تاریخ شعر میں یہ پہلی آواز ہے جو شعر برائے شعر کے خلاف بلند ہوئی۔ اسی کے ہم دوش ہمیں وہ واقعہ بھی نظر آتا ہے جسے جاحظ نے البیان والتبیین میں نقل کیا ہے کہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں ایک وفد آیا جس میں دو برابر کے سردار بھی تھے۔ ان دونوں میں چشمک تھی۔ لیکن اتنی بھی نہ تھی کہ ساتھ آتے جاتے نہ ہوں۔ ایک سردار نے دوسرے سردار کا تعارف کلمات تحسین سے کرایا۔ جس کا تعارف ہو رہا تھا اس نے کہا کہ یا رسولؐ اللہ! میرے اس تعارف

کرانے والے کو میرے اوصاف اس سے زیادہ معلوم ہیں لیکن اس نے تعارف کرانے میں کم بیان کئے ہیں۔ پہلے سردار کو یہ بات ناگوار گزری اس نے کہا یا رسولؐ اللہ! یہ بات بالکل درست ہے مجھے ان کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے اور میں نے کم بیان کیا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے اس شخص کے سارے عیوب ونقائص گنوا دیے۔ اس موقع پر رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: ان من البیان لسحرا وان من الشعر لحکمۃ. یقیناً کچھ بیان ایسے ہوتے ہیں جن میں جادو ہوتا ہے اور یقیناً کچھ شعر ایسے ہوتے ہیں جن میں حکمت ہوتی ہے۔ آپ نے من الشعر فرما کر بامقصد شاعری کو غلط شاعری سے الگ فرما دیا ہے۔

یہی صورتِ حال سورۂ شعراء میں سامنے آتی ہے جہاں ارشاد فرمایا گیا ہے: والشعراء یتبعھم الغاوٗن. الم ترانھم فی کل وادیھیمون. وانھم یقولون مالا یفعلون. الا الذین آمنوا وعملوا الصٰلحٰت وذکروا اللّٰہ کثیراً وانتصروا من بعد ظلموا. (۲۲۴،۲۲۵،۲۲۶، ۲۲۷) اور شعراء کی پیروی گمراہ افراد کرتے ہیں کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ لوگ ہر وادی میں سرگرداں پھرتے ہیں اور یہ وہ کچھ کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں مگر وہ لوگ جو مومن ہوں عمل صالح کرتے ہوں اور کثرت سے خدا کا ذکر کرتے ہوں اور مظلوم بننے کے بعد انہوں نے بدلہ لیا ہو۔ (وہ مستثنیٰ ہیں)۔

قرآن مجید کا نگاہِ مطہر میں ایمان، عمل صالح، ذکرِ الٰہی کی کثرت اور انتصارِ مظلوم وہ عناصر اربعہ ہیں جو شاعر اور شاعری دونوں کو مستحسن بنا دیتے ہیں اور انہی کے نتیجے کے طور پر شاعر کی زندگی بامقصد اور اس کی شاعری بامعنی ہو جاتی ہے۔ مولانا حسن امداد کی زندگی اور شاعری انہی عناصر کے زیرِ سایہ پروان چڑھی ہے۔ زیرِ نظر مجموعۂ شعر کے ممدوح، وہی افراد ہیں جو خود قرآن کے ممدوح ہیں۔ اسی طرح مولانا نے اپنی شاعری میں وہ معنویت اور مقصدیت پیدا کی ہے جو مطلوبِ قرآن ہے۔

عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ دینی مدارس کے پڑھے ہوئے شعراء ایک خاص قسم کے شعری تقشف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسا تقشف جس سے شعر میں معنیٰ تو پیدا ہو جاتے ہیں لیکن شعریت مفقود ہو جاتی ہے۔ اُس کے برعکس مولانا کے کلام پر اس خشکی اور تقشف کا سایہ بھی نہیں پڑا۔ اگرچہ آپ نے حکمت و عرفان کے دقیق ترین مسائل پر بھی گفتگو فرمائی ہے جس کی بہترین مثال آپ کی نظم "حقیقتِ ساحل" ہے۔ اس کے دو اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

وہ خط جو نظر آ نہیں سکتا ہے مگر ہے
جو دیکھ لے اُس کو وہ بڑا اہلِ نظر ہے
وہ خط کہ پتہ جس کا کسی نے بھی نہ پایا
وہ خط کہ جہاں دھوپ سے ٹکراتا ہے سایہ

اسی طرح یہ شعر تخلیقِ اوّل کی بہترین عرفانی توجیہہ ہے:

ہوا یوں پَرتوِ نورِ ازل مثلِ بشر پیدا
کہ جیسے آئینہ میں صورتِ آئینہ گر پیدا

زیرِ نظر مجموعہ میں سب سے پہلی چیز جو ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ مترنم بحروں کا انتخاب ہے جو ان مصرعوں سے واضح ہے:

ـ ظہورِ ساقی کے بعد رندو یہ مے پرستی نہیں چلے گی
ـ ہجومِ خلائق بڑھا جا رہا ہے
ـ اے بنی ہاشم کے چاند اے پسرِ بوتراب
ـ قدم قدم پہ ہے خوشی سرور گام گام ہے
ـ قطروں میں گوہر کوئی نہیں ہے
ـ لوگ آلِ پیمبرؐ کو سمجھے نہیں

آخری مصرع کی بحر شاعر کی پسندیدہ ترین بحر ہے۔ جس میں متعدد نظمیں ہیں۔ اس مجموعہ کی بیشتر زمینیں طبع زاد ہیں اور مشکل ردیفوں سے ترتیب پاتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی قدرتِ کلام ردیفوں کو مضمون کے ساتھ اسی طرح پیوست کر دیتی ہے کہ شعر سہلِ ممتنع بن جاتا ہے۔

فتحِ خیبر مقدر پہ موقوف ہے
اور ایسا مقدر فقط ایک ہے
وہ جو سیلابِ لشکر کو بڑھنے نہ دے
ایسا سدِ سکندر فقط ایک ہے

جس کی آمد کی محشر میں اک دھوم ہو
ایسی خاتونِ محشر فقط ایک ہے

زیرِ نظر مجموعہ میں مولانا حسن امداد کی شاعری کا محور کچھ اولوالعزم اور عالی مرتبت شخصیتیں ہیں۔
عمومی طور پر شخصیات کے بارے میں انسانی جذبات کا رویّہ ہمیشہ سے غیر منطقی رہا ہے اور ذاتی پسند و ناپسند کی بنیاد پر ردِ قبول کے فیصلے ہوتے رہے ہیں گویا ہر شخص نے شخصیت کو اپنے ذاتی معیار سے پرکھا اور پھر اُسے اپنا مثالیہ بنالیا۔ اس صورتِ حال کے برعکس مولانا نے شخصیتوں کو کتاب و سنت کے معیار پر پرکھا ہے۔ جس کے سبب کلام کا موضوع ذاتی پسند سے بلند ہو کر آفاقیت کی سطح پر آ گیا ہے۔
وہ شخصیتیں جو شاعر کا موضوع ہیں خیالی نہیں بلکہ حقیقی انسان ہیں اور فقط انسان نہیں ہیں کردار ہیں اور فقط کردار بھی نہیں ہیں وہ ایسا کردار ہیں جنہیں پوری انسانیت کے لئے اسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل بنایا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ بیشتر نظموں کا تعلق کردار نگاری سے ہے۔ کردار نگاری صرف زبان اور بندش کی خوبیوں کا نام نہیں ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جب تک کردار کا گہرا مطالعہ ساتھ نہ ہو کردار نگاری ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ نظمیں اس بات کا بہترین مظہر ہیں کہ شاعر کی نگاہ سیرت اور مقتل کی کتابوں پر اور کرداروں کی جزئیات پر بہت گہری ہے اور دقتِ مطالعہ کے ساتھ ساتھ شاعر کی جودتِ طبع میں جو مضمون آفرینیاں کی ہیں وہ نظموں کے شعری مرتبے کو دوبالا کر دیتی ہیں۔ اس مقام پر چند مثالیں نامناسب نہیں ہوں گی۔
ایک نظم کا عنوان ہے "اس جواں کی مگر بات ہی اور ہے" نظم کا عنوان خود اس بات کا غماز ہے کہ اُس جوان میں کچھ ایسی خصوصیات ہیں۔ جو اُسے دوسرے جوانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہ نظم جناب علی اکبر علیہ السلام سے متعلق ہے اور اس میں اُن کے خصائص نظم کئے گئے ہیں۔ ابتدائی تین بندوں میں دعویٰ ہے اور اس کے بعد کے بندوں میں دعوے پر دلیلیں فراہم کی گئی ہیں۔

کون ہے جس کو زہراؑ نے پالا نہیں
اس جواں کی مگر بات ہی اور ہے

پہلا مصرعہ اس اَمر کی دلیل ہے کہ شاعر کی نگاہ سیرت اور مقتل دونوں پر ہے۔

"تقدم ولدی" بڑی مکمل اور بھرپور نظم ہے۔ اس کا مرکزی خیال سید الشہداء علیہ السلام کا وہ حکم ہے جو نظم کا عنوان ہے۔ اگرچہ جناب علی اکبر کا مرحلہ شہادت اختلافی ہے لیکن جس مرحلہ کو سامنے رکھ کر یہ نظم لکھی گئی ہے۔ اُس کے جواز اور پس منظر کی اس سے بہتر عکاسی اردو کے رثائی ادب میں کم یاب بلکہ نایاب ہے۔ اس نظم میں جتنی گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے وہ صرف شاعری کے بس کی بات نہیں ہے جب تک کہ مقتل پر پوری نگاہ نہ ہو جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اسی طرح نفسیات کے ایسے لطیف رُخ ہیں جو کم نظیر ہیں۔ حسینؑ اور اکبرؑ باپ اور بیٹے بھی ہیں، نائب رسولؐ اور شبیہ رسول بھی ہیں اور امام و ماموم بھی ہیں ان ساری اضافتوں کا بین السطور میں لطیف ترین اظہار پایا جاتا ہے۔ خصوصیت سے یہ چند بند عجیب وغریب تاثر کے حامل ہیں۔

لو وہ دیکھو صفِ دشمن سے کماندار بڑھے
دمبدم کرتے ہوئے تیروں کی بوچھار بڑھے
تیغیں تولے ہوئے پیدل بڑھے اسوار بڑھے
سینہ تانے ہوئے اس سمت سے انصار بڑھے
ان پہ آنچ آئے نہ زنہار تقدم ولدی
کربلا ہو چکی تیار تقدم ولدی

وقت یہ وہ ہے کہ تلوار اٹھا لیں ہم لوگ
دینِ حق کو کسی صورت سے بچا لیں ہم لوگ
کیوں کسی اور پہ اس بار کو ڈالیں ہم لوگ
کیوں نہ یہ معرکہ خود آپ سنبھالیں ہم لوگ
کھینچ کر نیام سے تلوار تقدم ولدی
کربلا ہو چکی تیار تقدم ولدی

دینِ نانا کا مٹے اور نواسہ سہہ لے
یہ نہ ہوگا کبھی ہم سے کوئی کچھ بھی کہہ لے

خون بہتا ہے تو ہم لوگوں کا اس پہ بہہ لے
بھیجتا جنگ پہ عابد کو میں تم سے پہلے
مگر عابد تو ہیں بیمار تقدم ولدی
کربلا ہو چکی تیار تقدم ولدی

مختصر ترین بات یہ ہے کہ یہ نظم اردو زبان کے رثائی ادب میں ایک اضافہ ہے۔ اسی طرح حضرت ابوالفضل العباسؑ کے سلسلے میں جو نظمیں ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

ع مرضی تو یہاں مرضیٔ معصوم میں ضم ہے
ع گر یہ بھی جدا ہو تو کمر شاہ کی خم ہے
ع مرضیٔ معصوم پہ نفس کو ڈالے ہوئے
ع کرب وبلا کا نظام سارا سنبھالے ہوئے

ان مصرعوں میں اتنی جامعیت ہے کہ حضرت ابوالفضلؑ کی پوری شخصیت نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ جناب مولانا حسن امداد قابلِ تحسین و تقلید ہیں کہ اُن کے اس مجموعہ میں ایسے مصرعوں کی کمی نہیں ہے۔ ایک طویل نظم جناب علی اصغرؑ کی شان میں ہے۔ ''فرصت ہو آپ کو تو ذرا کربلا چلیں''۔ اس مسدس میں مرثیہ ہو جانے کے سارے امکانات موجود ہیں لیکن مولانا نے اسے مرثیہ نہیں بنایا۔ اقبال نے بھی کہا تھا۔

ع ترکش مارا خدنگ آخرین

لیکن جناب علی اصغرؑ کے حوالے سے یہ بیت بہت بلیغ ہے۔

اس پہ تمام سلسلۂ دار و گیر ہے
یہ آخری حسینؑ کے ترکش کا تیر ہے

زیرِ نظر مجموعہ اپنے مخصوص امتیازات کے سبب اتنا ثروت مند ہے کہ یہ مختصر تحریر حق تبصرہ ادا کرنے سے قاصر ہے قاری کو دورانِ مطالعہ محاسن شاعری کے ایسے فراز ملتے ہی رہیں گے جو اس کی دلچسپی کو برقرار رکھیں گے جن میں کہیں ندرتِ مضمون ہوگی کہیں منظر نگاری کا سماں ہوگا اور بھرپور شاعری کا تموّج ہوگا۔

نعت گویوں نے معراج کو مختلف طریقہ سے نظم کیا ہے۔ لیکن ندرتِ مضمون کی یہ مثال اپنی ذات میں بڑی انوکھی ہے۔

آپ باشندۂ قوسین بظاہر مکی
آپ کا اصل وطن عرش بظاہر مدنی
آپ اگر عرش پہ پہنچے تو تعجب کیا ہے
کون ہے جس میں نہیں جذبۂ حب الوطنی

منظر نگاری کے ذیل میں یہ چند شعر ایک مخصوص فضا تشکیل دیتے ہیں۔

وہ شہر مدینہ وہ سرِ شام کا منظر
سُرخیِ شفق کچھ ابھی باقی ہے افق پر
تاریکیِ شب رنگِ شفق پر اثر انداز!
چشمِ رمد آلود فلک سُرمہ گہہ ناز
جیسے کہ فضاؤں میں کوئی سرمہ فشاں ہے
ہر ذرّے پہ نیلم کے برادے کا گماں ہے

اس طرح بھرپور شاعری کی مثال کے طور پر یہ چند مصرعے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جن میں یہ بتلایا گیا ہے کہ کربلا میں شریک ہونے والے جوانانِ بنی ہاشم نے حضرت ابوالفضلؑ سے تربیت حاصل کی تھی۔

غنچوں نے اس پھول سے گلبدنی سیکھ لی
تاروں نے اس چاند سے ضوفگنی سیکھ لی
تیشوں نے فرہاد سے کوہ کنی سیکھ لی
نیمچوں نے تیغ سے تیغ زنی سیکھ لی
تب کہیں جا کر ہوئی کرب و بلا کامیاب

تاریخ نویسی ایک مشکل فن ہے۔ اس مجموعہ میں ایک معتد بہ تعداد تاریخوں کی بھی ہے۔ کامیاب

ہوا بھی ہے جو جہتیں ہیں ان میں مقدمہ کے طور پر متعلق اشخاص کے ذاتی خصوصیات کو بھی حرفِ شمولیت دیا گیا ہے۔

''سوئے حرم'' مجموعی طور پر ایک ایسا ذخیرۂ اشعار ہے جس میں دین بھی ہے اور ادب بھی اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اس مجموعے کے مذکورہ دو عناصر میں سے کون سا عنصر زیادہ قوی ہے۔ دینی عنصر سے اس کا موضوع پیغمبر اکرمؐ اور ان کے اہلِ بیتؑ ہیں جن کا تذکرہ پوری کتاب کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ اور ادبی عنصر سے استعارہ، کنایہ، مجازِ مرسل اور تشبیہ وغیرہ (صنائع لفظی) اسے اس طرح آراستہ ہے کہ کوئی شعر اس سے خالی نظر نہیں آتی۔ بلکہ اگر تنقیدی نظروں سے دیکھا جائے تو اس مجموعے نے اردو زبان کے شعری لغت میں خوبصورت ترکیبوں کے اضافے کئے ہیں۔ جیسے قطرہ ہوا، خدنگِ ترکشِ قضاء، جزیرۂ دشتِ نجف، شکستِ جرأت، صفِ دوشنہ، مژگان، ریزۂ گل، مہ پارہ، دانۂ تسبیحِ نور، بیرِ پیشانی، گلشنِ معطر، پیرانِ دشتِ تحیر۔ یہ اور ایسی ہی دیگر تراکیب۔

میرے لئے یہ ضروری ہے کہ میں اس مرحلہ پر اپنے ان اختلافات کا ذکر کروں جن کے بغیر میری بات مکمل نہیں ہوتی۔ پہلی بات تو یہ کہ جناب مولانا نے اپنے معتقدات کے خلاف جہاں تبصرہ فرمایا ہے وہاں مجھے ان سے [illegible] ہے اور میں اس سے ذاتی طور پر اختلاف رکھتا ہوں اور دوسری بات یہ کہ مجھے بعض الفاظ کے غلط استعمال پر اس لئے اختلاف ہے کہ وہ بعض بحروں میں اس طرح تقطیع نہیں ہو سکتے جس طرح تقطیع کئے گئے ہیں لیکن شاید اس کا سبب یہ ہو کہ مولانا نے اپنے مضمون اور خیال کو اپنی شاعری پر فوقیت دینا چاہا ہے۔

طالب جوہری

☆☆☆☆☆

کتاب۔ ارمغان جمیل

شاعر۔ علامہ جمیل مظہری

سن اشاعت: ۱۹۹۵

# جمیل مظہری کی قصیدہ نگاری

اردو قصیدہ ان اصناف سخن میں ہے جن سے جدید ادبی مزاج مانوس نہیں رہا ہے۔ اولاً دربار کا ماحول جس نے قصیدہ کی پرورش کی، قائم نہیں رہا۔ ثانیاً مبالغے کی صنعت نے قصیدہ کو غیر فطری بنا دیا تھا۔ اس لحاظ سے قصیدہ کا زندہ رہنا مشکل تھا۔ اگر نعت اور منقبت کے مضامین اس صنف کو سہارا نہ دیتے تو آج شاید اس کی داستان تک نہ ملتی اور یہ قدرے افسوسناک بات ہوتی کہ قصیدہ کے نقائص کے ساتھ اس کی چند خوبیاں بھی تھیں۔

ترتیب مضامین نے تنظیم افکار کا ایک شعور پیدا کیا اور یہ شعور غالبؔ کے مشہور قصیدہ

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں

میں پروان چڑھا۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو غالب کا یہ قصیدہ سوداؔ اور ذوقؔ کے ہم مضمون قصائد سے کہیں زیادہ مشہور و مقبول ہے جن کے اسباب پر آئندہ سطور میں تبصرہ کیا جائے گا۔ موجودہ صدی کے اوائل اور گذشتہ صدی کے اواخر میں منقبتی قصیدہ کے دو مراکز قائم ہوئے ایک لکھنؤ ایک عظیم آباد۔ لکھنؤ میں عزیز مرحوم تھے جنہوں نے غالب کے مزاج سخن کی ترویج اپنے شہر میں کرنی چاہی اور عظیم آباد میں صفیر بلگرامی مرحوم تھے جو براہ راست غالب کے شاگرد تھے۔ عظیم آباد میں اس ذوق کی تجدید کا سامان والد ماجد مولانا محمد مصطفےٰ جوہر صاحب نے کیا جن کے متعلق علامہ جمیل مظہری مرحوم کا بیان ہے کہ انہوں نے "مولانا محمد مصطفےٰ جوہر صاحب کی صحبت میں قصیدہ نگاری شروع کی" (سہیل گیا جمیل مظہری نمبر حصہ اول ۱۸)

چونکہ قصیدہ نگاری سے میری نسبت خاندانی ہے اور میرا شعری سرمایہ بیشتر قصائد پر مشتمل ہے اس لئے محمد رضا کاظمی صاحب نے مرحوم کی قصیدہ نگاری کا موضوع میرے لئے مخصوص کیا ہے اور ان کا

اصرار ہے کہ میں جمیل مظہری کی انفرادیت کو اجاگر کروں۔ یہ ان کے اصرار کا نتیجہ ہے کہ تمہید میں غالبؔ کا ذکر نمایاں ہو گیا۔ چونکہ بہت ہی منفرد اسالیب کے مالک ہونے کے باوجود مرحوم نے بسا اوقات اپنی انفرادیت کو سخت ترین آزمائشوں میں ڈالا ہے اور سب سے بڑی آزمائش غالبؔ کے مشہور قصیدے کی تضمین اور غالبؔ کی زمین میں ان کا قصیدہ ہے۔

علامہ جمیل مظہری مرحوم رضا علی وحشت کے شاگرد تھے جن کو غالبؔ کی تقلید پر فخر تھا غالبؔ پر جمیل مظہری کے مدحیہ اشعار بھی مذکورہ بالا قصیدہ میں موجود ہیں اس کے باوجود ان کا تنقیدی رجحان میرؔ کی طرف رہا ہے۔

''غالبؔ کو آئندہ آنے والے زمانے کے معمار کی حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل ہے مگر خالص شاعر کی حیثیت سے میر میں زیادہ صلاحیت تھی۔ وہ فلسفہ کی ثقالت سے غزل کو صاف بچالے گئے ہیں۔ انہوں نے فلسفے کو غزل کے مزاج میں گھلا ملا دیا ہے کہ بالکل طلسمی چیز ہو گئی ہے۔ (ایضاً)

چونکہ اس رائے کا تعلق قصیدہ کی زبان سے ہے اس لئے یہ تفصیلی توجہ کا مستحق ہے۔ جب میرؔ کو قصیدہ میں کمتر اور سوداؔ کو غزل میں کمتر کہا گیا ہے تو فرق شوکت الفاظ کا ملحوظ رکھا گیا ہے اور آج جو میر کو خالص شاعر کہا جا رہا ہے تو غالبؔ کے شوکت الفاظ اور مشکل پسندی کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرؔ کی سادہ زبان کے مقابلے میں غالبؔ کے اشعار بدرجہا مقبول ہیں۔ فرق یہ ہے کہ میر زبان کو برتتے ہیں اور غالبؔ زبان کو وسعت دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جس مشکل پسندی سے غالبؔ نے آغاز کیا اس نے بالآخران کے اظہار کو جامعیت اور بندش کو چستی دی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جن مضامین کو غالبؔ نے میرؔ سے ہی مستعار لیا ہے وہ غالبؔ کے مشہور اشعار میں شامل ہیں مگر میرؔ کے مشہور اشعار میں ان کا شمار نہیں۔ دو مثالیں کافی ہوں گی۔

(الف)

جی ہی جائے میرؔ جو اپنا دیر کی جانب کیا کرے
یوں تو مزاج طرف کعبے کے بھیرا ہم لاتے ہیں
(میرؔ)

اور

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی
(غالبؔ)

ب)

کہا تھا میں نے بہت بولنا نہیں ہے خوب
ہمارے یار کو سو اب ہمیں سے بات نہیں
(میرؔ)

اور

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
(غالبؔ)

جمیل مظہری کا فکر کو ثقالت سے تعبیر کرنا خود احتسابی کے ذیل میں آتا ہے۔جس طرح غالبؔ کا تفکر ایک اسلوب کا موجد بن گیا اسی طرح جمیل مظہری کا تفکر ایک اسلوب کا موجد بنتا ہے۔ فکر جمیل پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے محبوب نقاد نیاز فتحپوری نے جمیل مظہری کو غالب کا صحیح نمائندہ کہا ہے۔ یہ نیاز فتحپوری کی نکتہ دانی تھی جس نے نمائندہ اور مقلد کے فرق کو ملحوظ رکھا اگرچہ جمیل مظہری نے کبھی اپنے نقادوں کو سہولت نہیں پہنچائی ہے غالبؔ کے مذکورہ بالا قصیدہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غالبؔ کی مشکل ترین زبان ہے۔جس میں ارتباط معنی انفعال کے باوجود نمایاں ہوگیا ہے۔

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

انداز کا جو غزل میں چیستان ہے وہی طرز تکلم اس قصیدہ میں آ کر ظرف تنگنا نے غزل کو توڑ دیا ہے
ان دو اشعار میں افکار غالبؔ کی نفسیاتی بنیادر دیکھیے

ہرزہ ہے نغمہ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے آئینہ فرق جنون و تمکین
موج خمیازہ یک نشہ چہ اسلام چہ کفر
کجی یک خط مسطر چہ تو ہم چہ یقیں

غالبؔ اردو کا پہلا مفکر شاعر بھی تھا اور پہلا متشکک بھی۔ جب غالبؔ اپنی عقیدت کی فکری تزئین کرنے بیٹھے تو ان کے ذہن کی وسعتوں کو تشکیک کا چوکھٹا میسر ہوا۔ غالبؔ کی طرح جمیل مظہری کے وجدان کو دنیائے شعر میں داخل ہونے کا یہی سرا ملا ہے۔

ہماری میزانِ آگہی میں یقین کیا ہے گماں کی شدت
جو شک کی آغوش میں پلا ہو اصولاً ایمان بھی وہی ہے

علامہ جمیل مظہری سے ملاقات کے دوران میں نے ان سے کہا تھا کہ یہ شعر آپ کے شعری تجربے کی اساس ہے جس کی انہوں نے تائید کی تھی۔ پھر بھی چونکہ یہ شعر جمیل مظہری کی اسلوبی انفرادیت کا مظہر ہے وہ ہمارے اس سوال کا جواب مہیا نہیں کرتا کہ وہ غالبؔ کی زمین میں رہ کر مغلوب کیوں نہیں ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ جمیل مظہری نے ریاض بھی کیا ہے۔ غالبؔ کے قصیدہ کی تضمین میں انہوں نے اس قصیدہ کے لئے خود کو تیار کر لیا تھا۔ دو بند دیکھئے ایک بند میں وہ رنگِ غالبؔ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ایک بند میں ان کا اور ان کے عہد کا اثر نمایاں ہو گیا ہے۔

تا بہ کے بازی طفلانہ قرطاس و قلم
لفظ و معنی کی کشاکش میں تخیل کا ہے دم
چہ زمان و چہ مکان و چہ حدوث و چہ قدم
ہرزہ ہے نغمہ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے آئینہ فرق جنون و تمکین

ایک مرض ہے عصبی عشق کے آثار عجیب
وصل ہے جس کی دوائے عملی عقل طبیب

اور وفا عادتاً اک جذبہ پاپوش نصیب
کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب
بے ستون آئینہ خواب گران شیریں
(تضمین)

غالب کی ترکیبوں پر مہارت کے باوجود جمیل مظہری کا قصیدہ "مداح وممدوح" صدائے بازگشت بن کر رہ جاتا اگر صرف غالب کے وجدان نے انہیں دعوت سخن دی ہوتی ان کو غالب کے امکان نے متوجہ کیا اور ایک ہموار معیار دے گئے جس کی فکری سطح غالب کے قصیدہ کے برابر ہے۔ اگر بات امکان کی نہ ہوتی تو جمیل مظہری کا قصیدہ لامیہ بھی اعلیٰ درجہ کا ہوتا ان کا قصیدہ لامیہ ناکام ہے اس لئے ہے کہ وہ غالب سے چھوٹے اور محسن کاکوروی سے بڑے شاعر تھے۔ فکر و تعقل و کائناتی تناظر غالب اور جمیل مظہری کا مشترک موضوع ہے۔ غالب نے فرق جنون و تمکین کو لغو کہا اور جمیل مظہری نے عقل کو جنوں سے تعبیر کر کے عقل کی بے مائگی کا مقدمہ قائم کیا ہے۔

نہ تمنا نہ تماشا نہ تحیر نہ یقین
اک جنوں ہے یہ تعقل جسے کہیے تمکین
کبھی تصدیق کی منزل میں تصور سے بعید
کبھی تشکیک کی منزل میں تحیر کے قریں

☆

میری بے گانہ نگاہی سے خفا ناز کمال
میری افسردہ نگاہی سے خجل روئے حسیں
مختصر یہ کہ طلسمات خودی بھی ٹوٹا
تجلہ روح میں گم ہو گئی شمع تمکیں
(مداح وممدوح ۱۹۴۳ء)

تشبیب ثانی میں جمیل مظہری کی فنی وسعت زیادہ جلوہ گر ہے۔ یہاں وہ اپنی مرثیہ گوئی اور نظم

نگاری کا تجربہ بھی لائے ہیں اور ان کی منظر نگاری کی صلاحیت ادراک کی پیمائش اور فکر کے نظریاتی تناظر کی مصوری میں کام آئی ہے۔

بسکہ دشوار ہے اشیا کی حقیقت کا سراغ
آسماں گرد نظر زنگ تصور ہے زمیں
عرش دیباچہ تفصیل طلوع اسرار
فرش آئینہ ابہام ظہور خودبین
حیرت آموز تمنا ہے تماشائے بہار
سر بہ زانوئے تامل ہے نگاہ گلچین

اس آخری شعر پہ توجہ کریں۔ ایک معروضیت کے زاویہ سے جمود کی مصوری ہے جو بذات خود جامد مصوری نہیں ہے بلکہ متحرک مصوری ہے جو نفس کیفیت کو اجاگر کر رہی ہے۔

یہی ہے جمیل مظہری کی فنی خلاقیت کا لمس جس نے تقلید غالب میں بھی ان کی انفرادیت کو پروان چڑھایا۔ ابھی بات تشبیب تک محدود تھی۔ مدح میں جمیل مظہری غالب کے سائے سے بالکل نکل آئے ہیں اور جدید رنگ شاعری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

جس کے سینے میں یتیموں کے لئے باپ کا دل
جس کے سائے میں نصاریٰ کو عدالت کا یقین
بے نوایاں بصیرت کو رفیق رہبر
کسمپرسان عدالت کو انیس بالیں
وہی آقا جو پہنتا ہو فقیروں کا لباس
اور غلاموں کو پہناتا ہو لباس زریں

جمیل مظہری کا سب سے مشہور و مقبول قصیدہ "بے خانہ کوثری" ہے ۱۹۳۱ء میں عظیم آباد میں ایک یادگار محفل منقبت منعقد ہوئی تھی۔ اہل شوق کا ہجوم تھا۔ دلندیزی کے پشتے پر اکابر شعراء موجود تھے۔ یہ وہی پشتہ ہے جو خاص میر انیس کی پہلی مجلس کے لئے تعمیر کیا گیا تھا ان میں سے جن شعراء کے قصائد

مطبوعہ ہیں۔ان میں والد ماجد مولانا محمد مصطفےٰ جوہر مدظلہ، جناب اچھے رضوی (''صبح بنارس'' ان کے قصیدے ہی کا ایک حصہ ہے) اور جناب کاظم زار عظیم آبادی مرحوم ہیں۔ یہ غالباً واحد طرحی محفل تھی جس میں علامہ جمیل مظہری مرحوم نے قصیدہ پڑھا۔

جمیل مظہری کے اس قصیدے کی سب سے واضح خصوصیت اس کی رنگینی اور اس کا تغزل ہے تشبیب میں بہار کے مناظر بھی ہیں اور ساقی نامہ بھی۔

کفِ گل دیکھ کر یاد آ گیا رندوں کو پیمانہ
الٰہی خیر توبہ کی عجب موسم ہے رندانہ

یہ نہایت لائقِ توجہ بات ہے کہ سرشاری کا یہ عالم جمیل مظہری کے عشق مجازی سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ان کا مجموعہ غزلیات دیکھ لیجئے یہ کیفیت آپ کو نہیں ملے گی بلکہ یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ ان کی غزلوں میں تغزل کم ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ خمریات کے ذیل میں ان کی غزل کا کوئی شعر نمایاں نہیں۔ لیکن منقبت میں اور مرثیہ کے ساقی ناموں کی رنگینی اور سرشاری موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب سے ان کا جذباتی لگاؤ غیر معمولی تھا۔

بھری برسات ساون کا مہینہ دلربا موسم
کہ جس میں نالۂ شب گیرِ عشق تمکِ ہے مستانہ
گرجتا ہے برستا ہے جھما جھم ابر دریا دل
دھلا جاتا ہے رندوں کی دعا سے صحنِ میخانہ
بطرزِ شکوۂ بلبل نالہ کش اور مسنہ بندھی کلیاں
تبسم زیرِ لب جیسے کوئی معشوقِ فرزانہ

(میخانہ کوثری ۱۹۳۱ء)

''میخانہ کوثری'' میں مدح کا معیار مذکورہ بالا قصیدہ ''مداح و ممدوح'' سے بہتر ہے۔

ہے تو نام خدا ساقی درِ علم ہدیٰ ساقی
علی بابہا ساقی بقولِ پیرِ میخانہ

وہ درویش تونگر گروہ مولائے غضنفر فر
جو ہو جھولے میں اژدر در بیک شوخی طفلانہ

اور مدح میں ان کا رنگ جدید بھی حکمت طرازی کی پوری صلاحیت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

قسم اس صبح کے تارے کی جو چشم حقیقت میں
بچھڑ کے کارواں سے کہہ رہا ہو اپنا فسانہ
قسم اس آہ کی نکلے جو شب کو دل سے سائل کے
بھری بستی میں خالی پا کے کشکول گدایانہ

جمیل مظہری کی قصیدہ نگاری کا بیشتر حصہ نعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مشتمل ہے۔ اردو نعت کی روایت بہت پرانی اور مستحکم ہے لیکن چونکہ حمد کی طرح نعت بھی بہت مشکل صنف سخن ہے اس لئے اس صنف خاص میں اساتذہ کی تعداد کم ہے۔ حالی کے بعد نعت میں ایک رجحان سرایت کر گیا جس میں ذات ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمدنی فیوض کو مرکزی اہمیت حاصل ہوگئی۔ اس روایت کے پس پردہ نشاۃ الثانیہ کا تربیت یافتہ تاریخی شعور تھا جس کا اصرار ہے کہ فوق الفطری عناصر کو خارج از بحث رکھا جائے۔ حالی کے خلوص نیت میں کوئی شبہ نہیں پھر بھی ایک گونہ سطحیت نعت گوئی میں داخل ہوگئی۔

جمیل مظہری کے نعتیہ قصیدوں میں بھی اصلاحی رنگ موجود ہے لیکن ان کی مثالیت پرستی اور ماورائی تصور نے ایک مضبوط جذباتی بنیاد فراہم کردی ہے۔ ان کے یہاں اصلاحی مضامین کے ساتھ تغزل کا رچاؤ بھی آشکار ہے۔ یہاں یہ تصریح ضروری ہے کہ نظم اور قصیدے کے تقاضے الگ الگ ہیں چنانچہ جمیل مظہری کی نعتیہ نظموں میں اصلاحی رنگ نمایاں ہے۔ مثلاً

آنکھ کے اندھے کو دے دیتے تھے بینائی مسیح
عقل کے اندھوں کو لیکن دیدہ ور تو نے کیا

جب کہ نعتیہ قصیدوں میں فکری تجسس کے ساتھ ایک سراپا سپردگی ہے۔

حسن سراب رنگ و آب حسن حجاب رنگ و آب
عشق کہاں تک کرے ذوق نظر کی چاکری

رسم فغاں تک آ گئی پائے بتاں تک آ گئی
عشق کا سر جھکا چکی عقل عقل تری سبک سری

(حدیث دلبری ۱۹۲۹ء)

نزاع باہمی ہو جائے گی طے دین و دنیا میں
گزر جائیں گی اونٹوں کی قطاریں چشم سوزن سے
مراحل ارتقاء کے جبرئیل عقل سے پوچھو
پر پرواز لرزاں ہے بلندی نشیمن سے
زمانہ سر جھکائے ہے نقوش پائے تمکیں پر
خدائی لو لگائے ہے چراغ روئے روشن سے

اس قصیدہ کے اصلاحی رنگ فریاد میں ڈھل گیا ہے۔

اٹھ اے بالیں نوازؐ خواب گاہ گنبد خضرا
عنان رہنمائی بڑھ کے لے لے دست روزن سے
عطا ہو پھر انہیں توفیق تعمیر مکان دل
جو تعمیر حرم کرتے ہیں سنگ و خشت و آہن سے
عطا ہو خواجگان زر کے تند و تیز تیور کو
ذرا سا خلق تھوڑی سی مروت اپنی چتون سے

(طلوع سحر ۱۹۳۵ء)

ان کا آخری قصیدہ فضیلت خاک بھی نعتیہ ہے یہ ۱۴۰۰ھ کی تصنیف ہے یہ غیر مطبوعہ نعت محمد رضا کاظمی صاحب سے مجھے ملی ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔ ایسی مشکل زمین میں شعر کہنا ان کا شعار نہ تھا لیکن آخر عمر کے اس قصیدہ میں آورد کا شائبہ نہیں اور عشق رسول کی سرشاری جاری وساری ہے۔

قول عزازیل کی رو مکرر ہے خاک
خاک سے بجھتی ہے آگ، آگ سے برتر ہے خاک

نکہت زلف رسولؐ سلسلہ تیرا ہے طول
تجھ سے معتبر ہے خاک، تجھ سے معطر ہے خاک
تجھ پہ خودی کا سلام، تجھ پہ خدا کا سلام
تجھ سے مہذب ہے نار، تجھ سے مطہر ہے خاک

(فضیلت خاک۔۱۹۸۰ء)

یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ علامہ جمیل مظہری کے ہر قصیدہ کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے۔ ''وجدان جمیل'' کے قصائد میں تاریخی شعور کے ساتھ اصلاحی رنگ نمایاں ہے اور فکروفن پر حاوی ہے بلکہ ایسا نظر آتا ہے کہ فن کی طرف سے ان کی توجہ عمداً کم ہو گئی تھی۔ یہ خاص دور ۱۹۷۸ء میں ختم ہو گیا اس سال انہوں نے حضرت امام حسنؑ کی مدح میں جو قصیدہ تصنیف کیا ہے اس میں فکر کی رفعت کے ساتھ بیان کی رعنائی پوری طرح جلوہ گر ہے۔ (عرفان جمیل۔ اشاعت دوم) ''وجدان جمیل'' کے بیشتر قصائد طویل ہونے کے باوجود مزاجاً نظم کے قریب ہو گئے تھے۔ سبط اکبر کی شان کا قصیدہ مختصر ہونے کے باوجود مزاجاً قصیدہ ہی ہے۔

سوچ رہا ہے چپ کھڑا رہرو راہ ارتقا
چار طرف ہیں مظہری سلسلہ ہائے نقش پا
چشم ہوس بھی بند ہے چشم خرد بھی بند ہے
کچھ ہے غبار آگہی کچھ ہے غبار ما سوا
علم تیرا علیم تر حلم تیرا حلیم تر
خلق تیرا عظیم تر مثل نبیؐ دوسرا
زین العباء سے تا رضا تا بہ تقی و عسکریؑ
تیرے قدم قدم چلے آٹھ آئمہ ہدیٰ
خون رگ حسینؑ یا سوز دل حسنؑ جمیل
حدت قلب مصطفےٰؐ شدت عزم مرتضےٰؑ

میرا عقیدہ ہے عیاں پھر بھی ہوں ان کا مداح خواں
میرے شکوک اور گماں میرے یقین پر فدا
(فیضان امامت ۱۹۷۸ء)

آخری شعر دیکھیں۔ یہی شک کی آغوش میں پلنے والا ایمان ہے اور یہی جذبہ جمیل مظہری کے تخلیقی وجدان کا سرچشمہ بھی ہے۔ یہ جذبہ ان کی شاعری کے ہر دور میں ملتا ہے۔ نئی شان اور نئی آن کے ساتھ۔

اب آیا ہوں ترے در پر مئے عرفاں کی جھیکیں دے
تری چوکھٹ کی خنکی کو سر سودا نے پہچانا
یہ سنتا تھا کہ میں نے رکھ دیا سر پائے ساقی پر
مقام اپنا مری فکر فلک پیما نے پہچانا
(کائنات)

اور بلاشبہ یہ جذبہ ان کے لئے سرمایہ نجات ہے۔

☆☆☆☆☆

maablib.org

کتاب۔ گریۂ فرات

شاعر۔ سردار نقوی

سنِ اشاعت: ۱۹۵۹

# تجزیاتی مرثیے

## تحریر: علامہ طالب جوہری

پروفیسر سردار نقوی کی شہرت اگر مرثیہ نگاری کے سبب نہ ہوتی جب بھی وہ گمنام نہ ہوتے۔ ایک تجربہ کار ماہر تعلیم، خوش قلم نثر نگار، اچھے مترجم اور علم طبقات الارض کے استاد کی حیثیت سے پہچانے جاتے۔ لیکن یہ ان کی افتادِ طبع کا نتیجہ ہے کہ آج وہ صفِ اول کے اہم مرثیہ نگار کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ میں نے افتادِ طبع کی ترکیب جان بوجھ کر استعمال کی ہے اس لئے کہ انسان کے علمی اور فکری کام میں اگر اس کی افتادِ طبع شامل نہ ہو تو اس سے صفِ اول کی تخلیق کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

سردار نقوی نوجوانی میں فلسفہ جدلیت کے قائل تھے۔ وہ جدلیت کے اب بھی قائل ہیں لیکن مادی جدلیت کے نہیں، حق و باطل کی جدلیت کے۔ مادی جدلیت کے نقطۂ نظر سے تھیسس اور اینٹی تھیسس کے تصادم سے سنتھیسس کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ یہ سنتھیسس مذکورہ دونوں متضاد دعویات کا باقی ماندہ مجموعہ ہوتا ہے۔ حق و باطل کی جدلیت میں یہ اس لئے ممکن نہیں ہے کہ اگر ٹکرانے کے بعد حق و باطل کا باقی ماندہ مجموعہ ظہور پذیر ہو تو وہ نہ حق محض ہوگا اور نہ باطل محض۔ ایک تیسری چیز ہوگی اور اس چیز کا وجود محال ہے۔ اس کی توضیح جوہر و عرض کی بحث سے بچتے ہوئے یوں کی جا سکتی ہے کہ جو شے سفید ہو وہ کسی سبب سے سیاہ ہو سکتی ہے اور جو سیاہ ہو وہ سفید بھی ہو سکتی ہے لیکن سفیدی سیاہی بن جائے یا سیاہی سفیدی بن جائے یہ ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح عالم کسی حادثے کے سبب جاہل بن سکتا ہے اور جاہل کسب علم کرکے عالم بن سکتا ہے لیکن نہ علم جہل بن سکتا ہے اور نہ جہل علم بن سکتا ہے۔ اسی طرح دوست دشمن بن سکتا ہے اور دشمن

دوست بن سکتا ہے، لیکن دوستی دشمنی نہیں بن سکتی، اس لئے کہ شے کا اپنی ماہیت سے خارج ہو کر باقی رہنا ممکن نہیں ہے۔ ان ساری مثالوں کی روشنی میں حق پرست باطل پرست بن سکتا ہے اور باطل پرست حق پرست ہو سکتا ہے لیکن حق کا کوئی جزو باطل نہیں ہو سکتا اور باطل کا کوئی جزو حق نہیں ہو سکتا، اس لئے کسی ایسے مجموعہ کا وجود ناممکن ہے جو حق اور باطل دونوں کی آمیزش سے تیار ہوا ہے۔ کربلا کا اہم ترین کارنامہ ہی یہ ہے کہ اس نے حق کو باطل اور دین کو بے دینی سے الگ رکھنے کے لئے ان کے درمیان قیامت تک کے لئے ایک خطِ فاصل کھینچ دیا ہے۔ سردار نقوی کے مرثیے اس فلسفہ کا منظوم بیان ہیں کہ حق و باطل ٹکراتے ہیں، حق فتح پاتا ہے اور باطل شکست کھا جاتا ہے۔

جدید مرثیہ نگاری کے بیشتر مراثی موضوع یا کردار کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ عہد رواں کے کامیاب ترین مرثیے یا موضوعاتی ہیں یا کرداری۔ میں شدید اصرار کے ساتھ یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ سردار نقوی کے مرثیے نہ موضوعاتی ہیں اور نہ کرداری بلکہ اگر یہ اصطلاح مناسب ہو تو انہیں ''تجزیاتی مرثیے'' کہا جا سکتا ہے۔ ان تجزیاتی مراثی کی مرکزی فکر کچھ اس طرح بنتی ہے کہ شاعر کے ذہنی پس منظر میں مرثیہ کے لئے طے شدہ فقط ایک ہی موضوع ہے اور وہ ہے'' سانحہ کربلا اور اس کے اسباب ونتائج'' غالباً اسی وجہ سے شاعر مسدس کی شکل میں (کسی لفظ یا معنی پر) نظم کہہ کر اور اسے مصائب سے جوڑ کر مرثیہ نہیں بناتا۔ اس کے مرثیوں میں مرثیت کی فضا اول سے آخر تک قائم رہتی ہے وہ مصائب کی طرف گریز کرنے کے لئے کسی تشبیہ یا استعارے کا سہارا نہیں لیتا بلکہ مرثیہ میں بیان شدہ مطالب کے منطقی نتیجہ کے طور پر کربلا میں داخل ہو جاتا ہے۔ زیرِ نظر مرثیوں کا موضوع ایک مثلث ہے یعنی:

سانحہ کربلا کے اسباب۔ سانحہ کربلا کا وقوع۔ سانحہ کربلا کے نتائج

ان مرثیوں میں کچھ شخصیات اور تاریخی واقعات ایک موضوعی وحدت کی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں مثلاً نعت رسولؐ، منقبت علیؑ، مدح ابوطالبؑ وخدیجہؑ، اسلام کی اہم جنگی فتوحات، صلح حدیبیہ اور فتح مکہ وغیرہ۔ شاعر نے ان شخصیات وواقعات کے مطالعہ کے ذریعہ سانحہ کربلا کے اسباب کو تلاش کیا ہے اور پھر ذہن انسانی کو اس کے نتائج سے روشناس کرایا ہے، اس طرح اسباب سے نتائج تک کا یہ شعری

سفر ایک عقلی اور منطقی سفر کہا جاتا ہے۔

منطق صحیح طریقہ استدلال کے قوانین کا نام ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ استخراجی (Deductive) اور استقرائی (Inductive)۔ استخراجی منطق کلیات کو جزئیات پر منطبق کرنے کا نام ہے جیسے عالم متغیر ہے، ہر متغیر چیز حادث ہے۔ اس لئے عالم حادث ہے، استقرائی منطق جزئیات سے کلیات بنانے کے عمل کا نام ہے جیسے یہ مشاہدہ کے انسان پیدا ہوتے اور فنا ہوتے رہتے ہیں، ایک کلیہ کی تشکیل کا سبب بنتا ہے کہ تمام انسان فانی ہیں۔

سردار نقوی نے اپنے مراثی میں منطق کی دونوں قسموں کا کامیاب استعمال کیا ہے۔ ان کا ایک مرثیہ اس مطلع سے شروع ہوتا ہے۔ شہر ابلاغ میں پھر باب وفا کھلتا ہے۔ اس کے ابتدائی دس بندوں میں جزئیات پر نگاہ ڈال کر مخاطب کو جس طرح کلیہ سے روشن کرایا گیا ہے وہ نفیس بھی ہے اور علمی مزاج کا آئینہ دار بھی۔ اس طرح ایک مرثیہ جس کا مطلع ہے عقل مسلم ہو تو ہادی کی ثنا کرتی ہے۔ اس کے ابتدائی چند بندوں میں جس طرح کلیات سے جزئیات کی طرف سفر کیا گیا ہے وہ شاعر کے فکری شعور کا غماز ہے۔

کربلا کے سلسلہ میں ان دونوں منطقوں کا استعمال اس بات کا ثبوت ہے کہ سردار نقوی کربلا کو پوری انسانی زندگی پر (بلا لحاظ ادوار و زمانہ) محیط سمجھتے ہیں اور وہ انسانی مسائل کا حل بھی اسی میں تلاش کرتے ہیں، ان کے نزدیک کربلا ایک واقعہ نہیں ہے بلکہ دین یا اسلام کے مترادف ایک اصطلاح ہے۔ اسی وجہ سے میں سوچنے پر مجبور ہوں کہ وہ اپنے عقیدتی رجحانات میں خواجہ اجمیر کے مقلد ہیں (دین است حسینؑ)......اور اپنے طریقہ استدلال میں اقبال اور غم میں جمیل مظہری سے الہام پذیر ہیں۔ اقبال کے یہ مصرعے اسی بات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

حقیقت ابدی ہے مقام شبیریؑ
ایں دو قوت از حیات آید پدید
مقصد او حفظ آئین است و بس
سطر عنوان نجات ما نوشت

مجھے معلوم نہیں کہ سردار نقوی میری اس بات سے اتفاق کریں گے یا نہیں؟...... کہ ان کی مرثیہ

نگاری جمیل مظہری کی مرثیہ نگاری کا اثر پذیر تسلسل ہے۔ لیکن میں اس پر یقین رکھتا ہوں۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ۔

عصر حاضر تری میزان تفکر کیا ہے
تیری تہذیب کا تاریخی تناظر کیا ہے
آدمیت کے لئے وجہ تفاخر کیا ہے
یعنی انسان مثالی کا تصور کیا ہے
سرحد جسم سے آگے بھی نظر ہے کہ نہیں
عقل کو اپنی حقیقت کی خبر ہے کہ نہیں

تو جمیل مظہری کا پورا فکری فلسفہ اپنے پورے نظم کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔
جمیل مظہری کے انداز بیان کی گرفت اس حد تک مضبوط ہے کہ مصائب کے بندوں میں بھی نمایاں ہو جاتی ہے اس کے ثبوت میں یہ بند پیش کیا جا سکتا ہے۔

آگ خیموں میں بھڑکی تو ہوائیں روئیں
شمع کے سوگ میں مقتل کی فضائیں روئیں
آ سکیں جو نہ لبوں تک وہ صدائیں روئیں
ظالموں نے جنہیں چھینا وہ ردائیں روئیں
عظمتِ آلِ پیمبرؐ کی قسم کھاتی تھیں
چادریں آیۂ تطہیر پڑھے جاتی تھیں

یہ بند مصائب نویسی اور شعریت کا مکمل متوازن امتزاج بھی ہے اور جمیل کے اسالیب شاعری کا ایک اسلوب بھی جیسا کہ جمیل کے ایک مقطع سے واضح ہوتا ہے۔

کہتے کہتے یہ ہوئیں دخترِ زہراؑ خاموش
ہوئی مقتل میں اذاں، ہو گیا صحرا خاموش

تو بھی اس وقت جمیل سخن آرا خاموش
دیکھ تو ہو گئی کیوں گونجتی دنیا خاموش
کر چکا خوں سے وضو، میر حجازی شاید
سجدۂ شکر میں ہے ان کا نمازی شاید

سردار نقوی کو علم طبقات الارض کی سنگلاخ سرزمین نے مطالب کو پھیلا کر ان کا مغز پیش کرنے کا عادی بنا دیا ہے، اس وجہ سے ان کے مراثی میں کسی بھی مسئلے کے جزئیات و تفاصیل کم نظم ہوئے ہیں اور ان کے شعری سرمائے میں کم و بیش ہر مقام پر ایجاز اور جامعیت کا ایک مخصوص مزاج قائم رہتا ہے۔ جس کے سبب اکثر اوقات ایک مصرع پورے مضمون کی سرخی بن جاتا ہے یہ ایک ایسا امتیاز ہے جو انہیں اپنے ہم عصر مرثیہ نگاروں سے الگ کرتا ہے۔ ان کے مراثی میں یہ کیفیت عام ہے۔ لیکن مندرجہ ذیل بند اس کی بہترین مثال ہے۔

نصر کا ہاتھ بھی اس ہاتھ کی طاقت بھی علیؑ
عدل کی تیغ بھی اس تیغ کی ضربت بھی علیؑ
ضربِ خندق بھی علیؑ، نہج بلاغت بھی علیؑ
طاقت و خیر کے اضداد کی وحدت بھی علیؑ
کبھی نقطہ کبھی قرآن نظر آتی ہے
شخصیت عدل کی میزان نظر آتی ہے

اتنی سوچی سمجھی ہوئی تعریف اپنی مثال آپ ہے اور اس بند کا ہر مصرع ایک طویل و بسیط مقالے کا عنوان ہے۔

کتاب و سنت سے متعلق سردار نقوی کی معلومات غیر منہضم نہیں ہیں اور اس کا ثبوت مذہبی تلمیحات کی وہ رو ہے جو ان کے شاعری کے ساتھ چلتی رہتی ہے اور ایسے مصرعوں کی صورت میں رونما ہوتی ہے۔

؎ کنز مخفی کی تجلی کا جلی آئینہ
؎ جس کو رحمٰن سے قرآن کی تعلیم ملی

؎ چشم قرآنی میں چوپایوں سے بھی پست ہوئے

؎ قرآن دلیل، فاتبعونی گواہ ہے

اور کہیں یہ رو پورے بند پر محیط ہو جاتی ہے:

وہ شہر علم جس کی ثقافت ہے اعدلو
وہ شہر علم جس کی معیشت ہے انفقو
وہ شہر علم جس کی کرامت ہے اتقو
وہ شہر علم جس کی بشارت ہے تفلحو

قرآن تلمیحات کے حوالے سے اردو کے رثائی ادب میں ایسے بند کم نظر آتے ہیں۔

زیرِ نظر مراثی کے اجزائے ترکیبی میں نعت رسول کا التزام ایک بلیغ اور خوبصورت کوشش ہے۔ ساقی نامہ عام سطح کا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محض خانہ پری کے لیے نظم کیا گیا ہے۔ مرثیہ میں اس کا اضافہ غالباً حضرت رشید کی جدت طبع کا نتیجہ ہے۔ جو چیز انسان پر طاری نہ ہو اور ذاتی تجربہ کے حصار میں نہ آئے اس کا بیان بھی واقعیت اور لطافت سے ہمکنار نہیں ہوتا۔ (مگر یہ کہ روز تخیل سماں باندھ دے اور یہ شاذ ہے) اسی طرح بعض مراثی میں گھوڑے اور تلوار کا بھی تذکرہ ہے جو مرثیوں کی علمی فضا میں اجنبی محسوس ہوتا ہے اگرچہ بعض مصرعے مضمون آفرینی اور ندرت خیال کا نمونہ بھی ہیں۔

مجھے قوی امید ہے کہ یہ مجموعہ اردو کے ذخیرہ مراثی میں ایک اہم اور دلکش اضافہ ثابت ہوگا اور سردار نقوی ایک دن اپنی اس منزل کو پالیں گے جسے اب پالینا چاہیے۔

☆☆☆☆☆

maablib.org

کتاب۔ مجودِ خامہ
شاعر۔ اسیرؔ فیض آبادی
سنِ اشاعت: ۱۹۹۵

# علامہ طالب جوہری مدظلہٗ

یہ ممکن نہیں ہے کہ کراچی کی رثائی اور منقبتی شاعری کا تذکرہ ہو اور اسیرؔ فیض آبادی کو نظر انداز کر دیا جائے۔ انہوں نے اس شہر کی منقبتی محفلوں، رثائی مجلسوں اور شعری اجتماعات میں تقریباً ایک قرن گزارا ہے۔ فیض آباد کے ایک ادبی اور شعری گھرانے کے فرد ہوتے ہوئے بھی برسہا برس اس شہر کے مستند اساتذۂ فکر و فن سے استفادہ کیا ہے اور اب بحمد اللہ وہ خود صاحبانِ افادہ میں شامل ہیں۔ انہوں نے تقریباً ہر متداول صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن منقبت اور مرثیہ سے عہد باندھ رکھا ہے۔

مرثیوں اور منقبتوں کی روایت بہت قدیم ہے اور قدیم شعراء نے ان اصناف میں فکر و فن کے جو جوہر دکھلائے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ قدیم و جدید شعراء میں عمرانی اقدار کی مباینت کے باوجود ممدوحین اور موضوعات قدرِ مشترک ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں اپنے لئے راستہ بنانا آسان کام نہیں ہے۔ آج کے متعدد مرثیہ نگار اور منقبت نویس قابلِ تحسین ہیں کہ انہوں نے بڑی عرق فشانی اور دیدہ ریزی سے اپنی راہیں خود تراشی ہیں۔ انہی میں اسیرؔ فیض آبادی بھی ہیں جو اپنا راستہ بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

یہ عہد اپنے آپ کو جذبات اور رومانیت کے طلسم سے تقریباً آزاد کرا چکا ہے۔ اس کی سوچ پر صدیوں سے دساتیر و اساطیر کی جو گرفت تھی وہ ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے اور اب وہ استدلال و برہان کی طرف مائل ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اسیرؔ فیض آبادی اپنے عہد کے شعری تقاضوں سے نا آشنا نہیں ہیں۔ ان کے لئے اپنے ممدوحین کا تذکرہ تنہا جذبے کی شدت کا اظہار نہیں ہے بلکہ عقیدہ ہے اور صرف عقیدہ نہیں ہے بلکہ ایسا عقیدہ ہے جس کی دیواریں دلیل و برہان کی نیو پر استوار ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے

اپنے شعر کی بنیاد جذبہ، عقیدہ اور دلیل کی مثلث پر رکھی ہے جس میں احساس کی شدت کے ساتھ نظم کی قوت سونے پر سہاگہ ہے۔

زیر نظر مجموعہ بیشتر امیرؔ فیض آبادی کے منقبتوں پر مشتمل ہے۔ منقبت کی خوبی یہ ہے کہ مفرد اشعار کی تنگنائے میں بڑے سمندروں کو سمیٹ لے۔ اس مجموعہ میں یہ خوبی کہاں تک پائی جاتی ہے میں اس کی صراحت کر کے شاعر اور قاری کے درمیان حجاب نہیں بننا چاہتا۔ البتہ میں جب جناب امیرؔ سے کوئی منقبت سنتا ہوں تو پختگی فکر کے ساتھ کلام کے چٹخنی اور اس میں ذاتی شعور کا رچاؤ۔۔۔ یہ سب مل کر میرے ذہن میں مودت آل محمد علیہم السلام کی ایک مخصوص فضا بنا دیتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ خوش ذوق قاریوں کے لئے گراں قدر ثابت ہوگا۔ انشاءاللہ

طالب جوہری

۲۵، ذی قعدہ ۱۴۱۹ھ

maablib.org

کتاب۔ ردائے صبر

شاعر۔ تصویر فاطمہ

سنِ اشاعت: ۱۹۹۶

# امکانات کی شاعری

## علامہ طالب جوہری

تصویر فاطمہ کی شاعری امکانات کی شاعری ہے۔ ابلاغِ مفہوم پر قوی تر گرفت کے امکانات، لفظیات اور نظریات میں تبدیلی کے امکانات اور لحہ بہ لحہ فکروفن کی نادیدہ لیکن معین منزلوں تک پہنچنے کے امکانات۔ اگرچہ ان امکانات پر نسلی اور موروثی چھاپ کے ساتھ ساتھ بزرگ محترم ثاقب مظفر پوری جیسے بابصیرت اور صاحبِ مطالعہ بزرگ کی سرپرستی کا سایہ بھی ہے لیکن یہ بہت بڑا ظلم ہوگا کہ زیرِ نظر مرثیوں کے محاسن کا سارا محصول بزرگوں کے کھاتے میں ڈال دیا جائے۔ خود فنکار کا اپنا قریحہ اور ذہنی طباعی ہر بند میں نمایاں ہے جو اس بات کا اعلان کرتا ہے یہ کہ عمل شعر بزرگوں سے استفادہ ہے نری تقلید نہیں ہے۔

میں ان مراثی کے مطالعہ سے قبل ان سلاموں کو بھی دیکھ چکا ہوں جن میں غالب کی زمینوں پر کاشت کاری کی گئی ہے۔ میں اُسی زمانے سے متوقع تھا کہ یہ سلام ایک دن کروٹ بدل کر مرثیے بن جائیں گے۔ موجودہ عہد میں پیچیدہ زندگی کے پیچیدہ تر مسائل اور اس کے مختلف میلانات ورجحانات کو بیان کرنے کی جو صلاحیت مرثیہ میں پائی جاتی ہے وہ بلا تردید کسی دوسری صنف میں نہیں ہے۔

مرثیہ نگاری کا فن مشکل فن ہے۔ چونکہ اس کی رواج یافتہ ہیئت مسدس کی ہے لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر بند اپنی ایک وحدت ہوتا ہے جو چھ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ شروع کے چار مصرعوں میں نمو اور ارتقاء کا عمل ہوتا ہے جبکہ آخری دو مصرعوں (بیت) میں اس کا فشردہ یا اس کی تائید مزید ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیت کی طاقت پچھلے چار مصرعوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یعنی ایک جہت سے

مرثیے کا ہر بند ایک الگ وحدت ہے۔ جس میں ایک مکمل خیال یا مضمون نظم کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ دوسری جہت سے وہی سارے بند اپنے سیاق و سباق کے اعتبار سے طویل فکری مسئلے یا مسائل کے اجزاء قرار پاتے ہیں۔ یعنی یہ وہ واحد صنف ہے۔ جس میں تلخیص اور تفصیل کی وہ معجز نما صلاحیت ہے جو کسی اور صنف میں موجود نہیں ہے۔ ''ردائے صبر'' کے عنوان سے جن مراثی کو پیش کیا جا رہا ہے ان میں مذکورہ دونوں جہتوں کا بڑا سوچا سمجھا ہوا توازن نظر آتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ پہلے اور چوتھے مرثیے میں اس کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔

صاحبانِ ذوق تک مرثیہ کی ترسیل کے دو ذریعے ہیں۔ اور یہ طے کرنا مشکل ہے کہ ان دونوں ذریعوں میں سے زیادہ اہم اور قوی کون سا ذریعہ رہا ہے۔ مرثیہ جس تواتر و تسلسل کے ساتھ منبروں سے پڑھا گیا ہے کم و بیش اسی تواتر و تسلسل سے مطبوعاتی صورت میں نشر بھی ہوتا رہا ہے۔ لہٰذا اگر اس میں سماعیاتی کشش کا التزام ضروری ہے تو اسی کے ساتھ ساتھ مطالعاتی جذب بھی لازم ہے۔ مجھے خوشگوار حیرت یا حیرت انگیز خوشی ہے کہ زیرِ نظر مراثی ترسیل کے دونوں ذریعوں کی بہترین کوشش ہے۔

میں تصویرِ فاطمہ کے لئے دست بدعا ہوں کہ خداوندِ عالم بہ طفیل چہاردہ معصومینؑ انہیں شعر و ادب اور سلام و مرثیہ کی توفیق عطا فرماتا رہے۔

۱۸، مارچ ۱۹۹۶

☆☆☆☆☆

کتاب۔ لبِ کوثر
شاعر۔ کوثر نقوی
سنِ اشاعت: ۱۹۹۸

# تاثرات

## حجۃ الاسلام علامہ طالب جوہری

مجھے کوثر نقوی کے مذہبی کلام کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس مجموعہ کا نام "لبِ کوثر" ہے۔ مجموعے کا نام اپنی ذات میں خود ایک لطیف شاعری ہے۔ اس لئے کہ لفظ کوثر مادح اور ممدوحین کے درمیان مشترک ہے۔ قرآن مجید میں لفظ کوثر صرف ایک بار استعمال ہوا ہے۔ اور وہ بھی عطیۂ الٰہی کے حوالے سے۔ اب کوثر سے مراد کثرتِ خیر ہو یا آلِ محمدؐ ہوں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ آلِ محمدؐ کثرتِ خیر ہی کی تجسیم ہیں۔ اس مجموعے میں حمد و نعت اور ائمہ اثنا عشر علیہم السلام کی منقبتوں کے علاوہ جنابِ خاتونِ جنتؑ، جناب ابو طالبؑ اور کربلا کے شہیدوں اور اسیروں کی منقبتیں بھی ہیں۔ ان کے علاوہ سلاموں اور نوحوں کی بھی ایک معتد بہ تعداد شامل ہے۔

کوثر نقوی کی خلاقانہ صلاحیتوں سے انکار اس لئے ممکن نہیں کہ اُن کے مجموعۂ غزل "دارِ عشق" کو عصرِ حاضر کے مستند شعراء اور دانشوروں سے تحسین اور پسندیدگی کی سند مل چکی ہے۔ انہوں نے اس سلیقے سے شاعری کی ہے کہ ان کی مضمون آفرینی اور شدتِ احساس نے ان کے شعری جمالیات کو مجروح نہیں کیا ہے۔ لیکن زیرِ نظر مجموعہ اپنے محتویات کے لحاظ سے ایک خاص قسم کی احتیاط اور مخصوص دائرہ فکر و نظر کا متقاضی ہے۔ اس مجموعہ کی ساری شاعری شخصیتوں کے حوالے سے ہے لیکن ساری شاعری ایک زندہ اور رجائی شاعری ہے۔ اس لئے کہ یہ اشعار جن کرداروں کے بارے میں ہیں وہ کسی کہانی کے کردار نہیں ہیں بلکہ جیتے جاگتے، چلتے پھرتے اور سانس لیتے ہوئے انسان ہیں، ایسے انسان جو خدا کی راہ میں گردن دے کر یا اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزار کر زندہ و جاوید بن جاتے

ہیں۔ کوثر نقوی اپنی مذہبی شاعری میں 'کہیں' بھی ژولیدہ اور اُلجھے ہوئے محسوس نہیں ہوتے۔ ان کے اندرون میں اپنے ممدوحین سے جو محبت وعقیدت ہے وہ ابلاغ کی منزل میں بھی پوری طرح جلوہ فرما ہے اگرچہ مدحیہ اور رثائیہ شاعری کا تعلق والہانہ پن اور بے ساختگی سے ہوتا ہے لیکن کوثر نقوی کی اس شاعری میں شیفتگی اور بے ساختگی کے ساتھ ساتھ شعور کی ایک رو بھی دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اُن کے کلام میں جو معتقدات نظم ہوئے ہیں وہ ایقان کی ایک مخصوص فضا کے تربیت یافتہ ہیں لہٰذا وہ صرف معتقدات نہیں بلکہ نظریات ہیں جن کے پس منظر میں عقلی اور نقلی دلائل کا ذخیرہ موجود ہے۔ میرے اس دعوے کی تائید میں لبِ کوثر کے بہت سے اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کوثر نقوی نے منقبتوں، سلاموں بلکہ نوحوں تک میں اس کا التزام کیا ہے کہ شعر میں لطافت محفوظ رہے در و بست میں استحکام ہو۔ اور مشکل مضامین آسان اسلوب میں بیان ہوں اور اس اہتمام کے ساتھ بیان ہوں کہ لفظوں کی کرسیاں حفظِ مراتب کے اصول پر رکھی گئی ہوں۔ اس لئے کہ ایوانِ شعر میں رکھی ہوئی ان کرسیوں پر جذباتِ تغزل کو نہیں تخیلاتِ مودت کو بیٹھنا ہے۔ روایتی موضوعات میں تازہ بتازہ گوشے نکالنا اور انہیں تجربکارانہ تصرف کے ساتھ شعری قالب میں ڈھالنا بظاہر سادہ لیکن بباطن پُرکار عمل ہے اور کوثر نقوی اس عمل سے بخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ مجموعہ مذہبی اور اَدبی دونوں حلقوں میں وہ مقام حاصل کرے گا جو اِسے حاصل کرنا چاہیے۔

☆☆☆☆☆

maablib.org

کتاب۔ نمازِ سخن

شاعر۔ قسیم امروہوی

سن اشاعت: ۱۹۹۹

## علامہ طالب جوہری

نمازِ سخن قسیم ابن قسیم امروہوی کے مراثی کا مجموعہ ہے۔ قسیم نے خاندانی لہجہ کے تحفظ کے ساتھ ساتھ فکر کی جو جداگانہ بنیادیں رکھی ہیں وہ انہیں خاندانی میراث سے الگ کرتی ہیں اور وہی بنیادی قسیم ابن قسیم امروہوی کے مستقبل کی ضامن ہیں۔

☆☆☆☆☆

maablib.org

کتاب۔ لوحِ مودّت

شاعر۔ سرفراز ابد

سنِ اشاعت: ۲۰۰۱ء

## قبلہ علامہ طالب جوہری صاحب مدظلہٗ

سرفراز ابد کا تعلق ایک ایسے علمی و ادبی خانوادے سے ہے جن کا رشتہ شعر و سخن بہت مضبوط بھی ہے اور گہرا بھی، لہٰذا انہیں اپنے شوق اعتبار کے لئے کسی دوسرے سلسلۂ سفر کو تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ مختلف اصناف میں شعر کہتے ہیں لیکن سب سے پہلے مجھے اُن کا مرثیہ سننے کا موقع ملا۔ یہ وہ وقت تھا جب انہیں والد ماجد مولانا محمد مصطفےٰ جوہر اعلی اللہ مقامہٗ سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ ان دنوں سے لے کر اب تک میں نے سرفراز ابد سے بہت کچھ سنا ہے۔

ابد، مرثیہ، سلام رباعی، منقبت، غزل اور نظم غرض کہ سارے ہی میدانوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ اصناف کی مخصوص ہیئتیں مضمون کے مزاج کو بھی متاثر کرتی ہیں اور لفظیات کو بھی، ابد کے کلام میں، میں نے مضمون پر گرفت قابلِ قدر پائی اور لفظیات کا انتخاب مناسب اور برمحل۔ شاعری کی ٹھہری ہوئی جھیل میں کنکر پھینکنا ان کا مخصوص مشغلہ ہے، یہ اس جملہ کی تشریح میں ہے کہ ان کی منقبت طرحی ہو یا غیر طرحی، اس میں چند ایسے اشعار ضرور ہوتے ہیں جو شعری دربست اور مدح و ثنا کی روحانی اخلاقیات کی رو سے سامع کو مسحور کر لیتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ قدر ہے کہ اگرچہ غزل میں سرفراز ابد کا فکری رویّہ نیم علامتی ہے لیکن دینی شاعری میں اتنا واضح اور غیر مبہم ہے کہ ہر سطح کا سامع اور قاری اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

مدح و منقبت اور سلام و رثاء میں ان کا یہ واضح شعری رویہ اس بات کا غماز ہے کہ ان کی مذہبی شاعری نہ تنہا دفاغ کی کاوش ہے اور نہ صرف دل کا نتیجہ بلکہ دل و دماغ کی باہمی تعاون کی شاعری ہے۔ ان کا مذہبی شعروں کا یہ مجموعہ قارئین کے ہاتھوں تک پہنچ رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے

والے میرے ان معروضات کی تائید کریں گے۔

میں دعا گو ہوں کہ خداوندِ عالم بطفیلِ معصومین علیہم السلام سرفراز ابدکو دین وادب اور شعروسخن کی خدمت کی توفیق عطا کرتا رہے۔

☆☆☆☆☆

maablib.org

کتاب۔ پرسہ

شاعر۔ سردار نقوی

سن اشاعت:

# تاثرات

ان کے فضل و کمال کی بڑی جہتیں تھیں وہ مقرر بھی تھے اور شاعر بھی۔ انہوں نے منقبت بھی کہی اور نعت بھی، غزل بھی کہی اور نظم بھی مگر ان کی وجہ شہرت مرثیہ قرار پائی۔ وہ مرثیے کی جان بھی تھے آن بھی، وہ مرثیے کی فضیلت بھی تھے اور مرثیے کی بقا بھی تھے اور مرثیے کا استحقاق بھی۔

(علامہ طالب جوہری، مجلس برسی سے خطاب)

☆☆☆☆☆

maablib.org

کتاب۔ موت

شاعر۔ راغبؔ مرادآبادی

سنِ اشاعت:

# راغبؔ مرادآبادی......رباعی کی ایک نئی جہت

## علامہ طالب جوہری

حضرت راغبؔ مرادآبادی اپنی قدرتِ کلام اور بدیہہ گوئی کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں، اس میں کلام نہیں کہ وہ ایک ایسے بزرگ شاعر ہیں جنہیں مختلف اصنافِ سخن پر یکساں قدرت حاصل ہے۔لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ پچھلی دو تین دہائیوں سے رباعی ان کی شناخت ہے۔ان کی رباعیات کے زیرِ نظر مجموعہ کا موضوع "موت" ہے۔

موت ایک یقینی اور اٹل حقیقت ہے اتنی یقینی کہ عربی زبان میں اس کا ایک نام یقین بھی ہے۔کون نہیں جانتا کہ خدا کے وجود میں تو شک کیا گیا ہے لیکن موت میں کسی نے شک نہیں کیا۔(حضرت راغبؔ نے اس فکر کو اپنی ایک رباعی میں نظم بھی فرمایا ہے)۔اور اس میں شک ہو بھی نہیں سکتا اس لئے کہ جتنا فطری پیدا ہوتا ہے اتنا ہی فطری مرنا بھی ہے۔جب یہ اٹل بھی ہے، فطری بھی ہے، اور ناگزیر بھی تو پھر حضرت راغبؔ کو اس حقیقت سے اختلاف کیوں ہے؟اور اس سے اتنی شدید نفرت کیوں کرتے ہیں کہ اسے بدنسل، سڑی، اکل، کھری اور بیراگن اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں؟اس اختلاف کا سبب تو ہم بعد میں دریافت کریں گے پہلے یہ بتلا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ اختلاف جذباتی نہیں اُصولی ہے۔

ہر چیز ہے دسترس میں تیری اے موت
دشمن ہے نباتات و جمادات کی تو

..................

نادیدہ جراثیم کو کھا جائے گی
الفاظ و مفاہیم کو کھا جائے گی
پھر کس کی طرف جائیں گی اس کی نظریں
جب موت اقالیم کو کھا جائے گی

ایک رباعی میں پہاڑوں کے تذکرہ کے بعد چوتھا مصرع یوں ہے کہ

ان کے بھی گلے میں موت ڈالے گی کمند

ان حوالوں سے جو بات ہم پر واضح ہوتی ہے کہ شاعر لفظ موت کو صرف موت ہی معنی میں استعمال نہیں کرتا عدم کے مفہوم میں بھی استعمال کرتا ہے۔ چونکہ شاعر ایک زندہ موجود ہے لہٰذا اسے زندگی اور وجود کی نفیوں (موت اور عدم) سے اختلاف کا حق حاصل ہے۔

دورانِ مطالعہ اس اختلاف میں مسلسل تحیر، استعجاب اور لاعلمی کے اعتراف کی رو محسوس ہوتی رہتی ہے اور یہ اختلاف بھی تحیر اور سوالیہ نشان سے شروع ہوتا ہے کہ موت کی مملکت کے

☆ اطراف و جہات کیا ہیں میں کیا جانوں
☆ پھر موت سے انسان گریزاں کیوں ہے؟
☆ منشورِ اجل کیا ہے خدا ہی جانے
☆ کیا جانیے کیوں غروب ہو جاتے ہیں
☆ ظلمت میں عدم کی جگمگاتے چہرے

موت کے سلسلہ میں میرؔ نے ایک حتمی بات کہی تھی کہ

موت ایک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

حضرت راغبؔ نے اس رائے کی حقیقت کو قبول کیے بغیر ارتیابی اثبات کا اظہار کیا ہے:

ممکن ہے خیالِ میرؔ سچ ثابت ہو
راغبؔ کہیں ماندگی کا وقفہ نہ ہو موت

مذکورہ دونوں اشعار میں ماندگی کے جس وقفہ کی بات کہی گئی ہے اسے بھی دیکھتے چلیں۔اب تک کی معلوم انسان تہذیب کا پہلا دور ایک لاکھ سال قبل مسیح ہے۔ایک لاکھ سال پہلے کے انسان اپنے مُردوں کے ساتھ غذا دفن کرتے تھے جبکہ روحیں غذا نہیں کھایا کرتیں ان کا یہ عمل غماز ہے کہ ان کی فطرت کے بطون میں یہ بات پوشیدہ تھی کہ موت ایک ماندگی کا وقفہ ہے تھوڑا سا دم لے کر آگے کی طرف چلنا ہے۔موت کے خلاف راغبؔ صاحب کا احتجاج درحقیقت ماندگی کے خلاف ہے۔وہ زندگی میں مسلسل حرکت اور ارتقاء کے قائل ہیں، یہی سبب ہے کہ ان کی نگاہ میں موت ایک مسلسل فرسودگی کے عمل کا نتیجہ ہے۔

جب عمر کی چادر کو سمیٹے گی اجل
گر جائیں گے نظروں سے گلابی چہرے

..................

رہ جاتے ہیں سب خواب ادھورے جب موت
کرتی ہے بدن کے بیچ ڈھیلے کیا کیا

راغبؔ صاحب کی فکر کا یہی وہ موڑ ہے جہاں وہ روح وجسم کی ثنویت کے قائل نظر آتے ہیں کہ جسم کا تقاضا کچھ اور ہے اور روح کی خواہش کچھ اور۔

پھر بھی نہیں چاہتا کہ موت آ جائے
ہر چند کہ تھک چکا ہوں جیتے جیتے

..................

ہے موت کو واصلِ جہنم ہونا

..................

اللہ سے تو آنکھ ملا سکتی ہے؟

..................

اے موت مرے خدا کے ہاتھوں سرِ حشر
اک روز تو سنگسار ہونا ہے تجھے

یہ چند سطریں زیرِ مطالعہ رباعیات میں ایک مربوط و مسلسل نظامِ فکر کی تلاش کی ادھوری کوشش ہیں۔

خیامؔ کے ایک انگریز مترجم نے رباعیات کی مخصوص ترتیب سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان میں ایک باہمی ربط ہے اور یہی ربط خیام کی ایک منظم فکر کے اظہار کا سبب بنتا ہے۔ خیام نے اپنی رباعیوں میں اس رابطہ کے نظام کو تلاش کیا ہو نہ کیا لیکن اس تجربہ میں رباعی کی ایک نئی جہت کی دریافت کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ میں کہیں یہ تحریر کر چکا ہوں کہ جس طرح مسدس کا ہر بند اپنی ذات میں اکائی ہونے کے باوجود اپنے قبل و بعد سے مربوط رہتا ہے اسی طرح یہ طریقہ رباعی میں بھی رائج ہو سکتا ہے، کہ ہر رباعی اپنی ذات میں وحدت رکھنے کے باوجود دوسری رباعیوں سے جڑ کر ایک مسلسل و منظم المرجہ (Thesis) کا روپ دھار لے۔ راغب صاحب کے اس مجموعے میں اس کے امکانات بہت روشن ہیں۔

اس مجموعہ میں بکثرت ایسے الفاظ ہیں جو شعری ادب میں استعمال نہیں ہوتے اگرچہ راغبؔ صاحب سے قبل اُن کے مُرشد حضرتِ جوشؔ یہ اجتہاد کر چکے ہیں۔ راغبؔ صاحب کا یہ عمل اسی کا تسلسل ہے جو شعروں کی لفظیات میں اضافہ کا سبب قرار پائے گا۔

مجموعی طور پر رباعیات کا یہ مجموعہ اپنی صنف کا نمائندہ ہے جس میں صنف رباعی کے ترین نمونے موجود ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ صاحبانِ ذوق پوری توجہ سے اس مجموعہ کا استقبال کریں گے۔

☆☆☆☆☆

maablib.org

کتاب۔ اسلوبِ تعزیت

شاعر۔ شاداں دہلوی

سنِ اشاعت: ۲۰۰۵

## عالیجناب علامہ طالب جوہری مدظلہٗ العالی

معنی اور مفہوم میں بنیادی فرق یہ ہے کہ کلام سے سامع جو کچھ سمجھتا ہے وہ مفہوم ہے اور کلام میں متکلم جس بات کو مراد لیتا ہے وہ اس کا معنی ہے۔ اس اعتبار سے غالب کی شاعری مفہوم کی اور انیس کی شاعری معنی کی شاعری ہے۔ غالب کے بیشتر اشعار وہ ہیں جن میں قاری یا سامع اپنی سطح ذہنی کے اعتبار سے شعر کا مفہوم متعین کر کے اس سے حظ حاصل کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو غالب کو اپنے نہ سمجھے جانے کی شکایت نہ ہوتی۔

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

اس کے برعکس انیس کا دعویٰ یہ ہے کہ ع ایک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں۔ سوال یہ ہے کہ انیس کو ایک ہی مضمون سو رنگ سے باندھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اپنی مراد کو مخاطب کے ذہن پر نہیں چھوڑنا چاہتے۔ اسے واضح اور غیر مبہم طریقے سے اپنے سامع یا قاری تک پہنچانا چاہتے ہیں اور یہ شاعر دعویٰ نہیں کرتا ہے کہ شاعری کے ان دو رجحانات میں سے ایک کمتر اور ایک برتر ہے۔ بلکہ میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ یہ فرق دینی اور غیر دینی شاعری کے سبب پیدا ہوا ہے۔ غیر دینی شاعری کو تو ابلاغ کی ضرورت نہیں ہے جو دینی شاعری کا تقاضا ہے۔ دینی شاعری کرنے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی ساری توانائیوں کو اس بات میں صرف کرے کہ جس طریقے سے وہ بات کو سمجھا ہے بعینہٖ اسی طریقہ سے وہ بات مخاطب تک پہنچ جائے۔

شاداںؔ دہلوی کی شاعری کی شاعری ہے۔ وہ اپنے مخاطب کو اس وقت تک نہیں چھوڑتے

جب تک انہیں یقین نہ ہو جائے کہ مخاطب میری بات سمجھ گیا ہے۔ اس کا ثبوت ہر شے کے وہ مسلسل متواتر بند ہیں جو ایک ہی بات کے اثبات کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اس کی بہترین مثال ان کا وہ مرثیہ ہے جو وقار ادب کے عنوان سے ہے۔ اس مرثیہ میں انہوں نے پانچ بندوں (۲۱ سے ۲۵ تک) میں سید الشہداء کی معجزانہ شخصیت کے مختلف العباد و جہان کا تعارف کرایا ہے تا کہ مخاطب کو بقدر ظرف شخصیت کا ابلاغ ہو جائے۔ اس مرثیے میں بعنوان وقار ادب کے چند بندوں میں ضمیر کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اگرچہ ضمیر کا لفظ نفسِ امارہ کے مقابل نفسِ لوامہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن انہوں نے اسے مطلق نفس کے لئے استعمال کیا ہے۔ ان بندوں میں ضمیر کے مختلف جہات پر بڑی تفصیلی اور کامیاب گفتگو کی گئی ہے۔ یہ ایک مثال تھی ورنہ درحقیقت یہ طریقہ کار ان کے ہر مرثیے میں اپنی پوری پُر کاری کے ساتھ موجود ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری کے اظہار کا تمام تر دارومدار الفاظ پر ہے اور الفاظ کے استعمال کا تمام تر دارومدار شاعر کی اپنی ذات پر ہے۔ وہ ذات جو اپنی انفرادیت کے ساتھ ساتھ توارث، ماحول اور اکتساب کا مجموعہ ہوتی ہے۔ یہ انفرادیت، توارث، ماحول اور اکتساب وہ چار عناصر ہیں جن سے انسان کی فکر اور فکر کے اظہار کا رویہ تشکیل پاتا ہے۔ صاحب طرز ادیب اور شاعر وہی لوگ کہلاتے ہیں جو فکر اور اس کے رویۂ اظہار میں توازن کو پالیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ طویل ریاض اور برسوں کے تجربے کے بعد ہر شاعر کی اپنی لفظیات بن جاتی ہے۔ اور لفظوں سے قطع نظر، ایک منفرد پیرایۂ اظہار بھی بن جاتا ہے۔ جس کا وہ زندگی بھر پابند رہتا ہے۔ اب اسے شاداں کی خوبی قرار دیا جائے یا خرابی مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔ بہر حال انہوں نے اپنے آپ کو مخصوص لفظیات کا پابند نہیں بنایا ہے بلکہ ہر اس لفظ کو نظم کیا ہے جو ان کے فکر کے ابلاغ میں ممد و معاون ہوں۔

البتہ اپنے تشکیل کردہ پیرایۂ اظہار میں وہ بہت سنجیدہ ہیں اور اس سے سر مو تجاوز نہیں کرتے۔

اس دنیا میں مکمل اور مطلق راحت (خوشی) کا کوئی تصور نہیں ہے۔ وہ شے جو انسان کے لئے موجب راحت ہو اسی کی کثرت یا تواتر راحت کو رنج سے بدل دیتا ہے۔ تھکے ہوئے انسان کو بیٹھنے سے راحت ملتی ہے لیکن ایک منزل پر وہ بیٹھنے سے بھی تھک جاتا ہے اور لیٹ جاتا ہے لیکن یہی لیٹنا اگر اس کے لئے مکمل راحت ہو تو وہ کبھی اٹھنے کا تصور بھی نہ کرے۔ یعنی اگر یہ بیٹھنا اور لیٹنا صرف اور صرف

راحت ہوتے تو انسان ان سے کبھی نہ تھکتا۔ یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس پر دنیا کے ہر عمل کو تولا جا سکتا ہے اور اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ ہر راحت کا انجام غم ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس نے غم کو اس کا جائز مقام عطا کیا ہے۔ قرآن مجید نے تو واضح طور پر یہ فرما دیا ہے کہ "ہنسو کم اور رو زیادہ"۔ یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اظہارِ غم اللہ کی نگاہ میں پسندیدہ عمل ہے۔ شاداںؔ کے مراثی کا پورا ذخیرہ اگر سامنے رکھا جائے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ شاداںؔ کی نگاہ میں فلسفۂ غم کی وہی اہمیت ہے جو اقبالؔ کی نگاہ میں فلسفۂ خودی کی تھی۔ ان کے چند مطلع اس کا ثبوت ہیں۔

غمِ حسینؑ سے سرسبز ہے نہالِ سخن
غمِ حسینؑ کی دولت نصیب ہو یارب

اے اہلِ غم نمازِ مودّت قضا نہ ہو
یا رب غمِ حسینؑ مجھے بے شمار دے

غم شعورِ ذات و عرفانِ خدا کی بات ہے
غمِ حسینؑ سہارا ہے زندگی کے لئے

چیم نگاہ و دل پہ ہے طاری غمِ حسینؑ
مرثیہ مظہرِ کیفیتِ غم ہے اے دوست

شاداںؔ کی نگاہ میں غم کسی سانحے پر گریباں پھاڑ لینے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ عرفانِ حق اور تہذیبِ نفس کا وہ ناگزیر زینہ ہے جس کے بغیر ہدف تک پہنچنا ناممکن ہے۔

حسنِ عمل سے پاتا ہے عرفانِ حق بشر
عرفانِ حق سے خوفِ خدا ہے قریب تر

خوفِ خدا ہے جذبۂ غم کا پیامبر
غم ہے متاعِ دیدہ و دل قصہ مختصر

(میزانِ غم)

یہی چیز آگے چل کر غمِ شبیرؑ بن جاتی ہے جیسا کہ انہوں نے اس بیت میں کہا ہے۔

جو زمانے میں ہوا خوفِ خدا سے خالی
بس وہی دل ہے غمِ آلِ عبا سے خالی

فلسفہ کا مشہور نظریہ ہے کہ کوئی بھی شے جب اپنی آخری حد پر پہنچ جاتی ہے تو منقلب ہو کر اپنی ہی ضد بن جاتی ہے۔ یہی نظریہ غالبؔ کی زبان میں یوں ادا ہوا ہے۔ ع درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ شادانؔ دہلوی بھی فطرتِ انسانی کے عین مطابق راحت کی تلاش میں ہیں۔ لیکن اس تک پہنچنے کا طریقہ ان کی نگاہ میں یہ ہے کہ غمِ حسینؑ کو اس حدِ کمال تک پہنچا دیا جائے کہ وہ راحت بن جائے اور واقعۃً سلیم قلب اور سعید روح والے انسان کے لئے غمِ حسینؑ سے بڑی راحت اس عالمِ آب و گِل میں نہیں پائی جاتی۔

کراچی میں صفِ اوّل کے سارے ہی مرثیہ نگار وہ ہیں جنہوں نے برصغیر کی تقسیم سے قبل صدیوں کے بسے بسائے علاقوں میں آنکھ کھولی تھی۔ ان علاقوں کی تہذیب شہری ہو یا قصباتی، چھوٹی ہو یا بڑی، ہمیں اس سے غرض نہیں۔ لیکن وہ مطمئن، پُر امن، ہموار اور نسبتاً مسائل سے پاک تہذیب تھی۔ کراچی گوناگوں تہذیبوں کا جنگل ہے۔ آبادی کے اعتبار سے دنیا کے چند بڑے شہروں میں شامل ہے اور مسائل کے اعتبار سے دنیا کا پہلا شہر ہے۔ تجارتی ہونے کے سبب یہاں ہر انسان ترازو پر تولا جاتا ہے اور ہر اخلاق گزوں سے ناپا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ شعوری یا لاشعوری طور پر ان ہجرت زدہ شاعروں کے اندرون میں قدروں کی جنگ رہی۔ نہ ان قدروں کے درمیان مصالحت ممکن ہو ئی اور نہ جنگ بندی ہی ہو سکی۔ لہٰذا اس شہر کا شاعر کل وقتی جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا۔ یہی جھنجلاہٹ دبستانِ کراچی کی ایک خاص امتیازی صنف ہے جس نے لہجے سے دھیمے پن کو سلب کر لیا۔ اور اس کی جگہ تلخی اور تندی کے تخم ڈال دیئے۔ شاہد نقوی اور سردار نقوی کا لہجہ اس کی بہترین مثال ہے۔ لیکن شادانؔ کے مرثیوں میں لہجے کی تلخی

مذکور الصدر دونوں افراد سے زیادہ ہے۔ اس اعتبار سے یہ بھی شاداںؔ دہلوی کی مرثیہ نگاری کا ایک امتیاز ہے۔ میں اس کی تمام ادبی کاٹ اور شعری تیکھا پن کے اعتراف کے باوجود بھی اس طریقہ اظہار سے متفق نہیں ہو سکا۔

ہم عصر مرثیہ نگاروں کے مقابل شاداںؔ کے مراثی میں خطابت کا عنصر غالب ہے۔ شاعری دلوں کو نرماتی ہے اور خطابت دلوں کو گرماتی ہے۔ شاعری دلوں میں گھر کرتی ہے اور خطابت دلوں کو سر کرتی ہے۔ شاعری شبنم ہے اور خطابت شعلہ۔ بظاہر دونوں کا میدان الگ ہے اور مقصد بھی جداگانہ ہے۔ لیکن چونکہ وہ شاعری جو مرثیہ میں کی جاتی ہے اس خطابت کی سگی بہن ہے جو مجلس حسینؑ میں روبکار آتی ہے۔ لہٰذا ان دونوں میں ایک لطیف مقصدی ربط پایا جاتا ہے۔ اس نکتے کو شاداںؔ نے سمجھا اور خوب سمجھا۔ مرثیوں کا پہلا ذریعۂ ابلاغ منبر حسینؑ ہے اس لئے انہوں نے اپنے مراثی میں شعریت کے ساتھ ساتھ شعوری طور پر خطابت کے جادو بھی جگائے ہیں۔ یہ ان کا ایسا امتیاز ہے جو انہیں ایوان مرثیہ میں قابلِ ذکر رکھے گا۔ یوں تو خطابت کی فضا ان کے سارے مراثی پر محیط ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ "معیار قیادت" اور "غدیر اور بعد غدیر" میں زیادہ واضح نظر آتی ہے۔

مرثیہ نگاری میں نام ہی قدرتِ کلام کا ہے۔ جو قادر الکلام نہ ہو اس کے لئے مرثیہ نگاری کا کوئی جواز نہیں ہے۔ شاداںؔ دہلوی کے پاس یہ جوہر وافر مقدار میں ہے۔ وہ جس جذبہ یا فکر کو جس طرح چاہتے ہیں نظم کر لیتے ہیں۔ ان کے سوچنے کا انداز، تاریخی تحلیل و تجزیہ یا معاشرتی تبصرہ ان کا اپنا ہے لیکن لفظوں کے برتنے کا انداز انیسؔ اور نظیرؔ کے اسالیب سے مستفاد ہے۔ اس میں صحافتی لب و لہجہ کے چاشنی، مرثیوں کو جدیدیت سے قریب تر کرنے کی ایک گوارا کوشش ہے۔ اس استفادہ سے جو آمیزہ تیار ہوا ہے اس نے انہیں نقصان بھی پہنچایا ہے اور فائدہ بھی۔ وہاں مرثیے کی مجموعی فضا کے اعتبار سے خشکی پیدا ہوئی ہے اور فائدہ یہ ہے کہ انہوں نے بہت سے ایسے مصرعے کہے ہیں جو ضرب المثل بن جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ع      حسین عمر دو روزہ میں ایک قدر کی رات

ع      قرآن نے خسروی کا گریبان پکڑ لیا

شاداںؔ دہلوی کا تعلق بھی اس قبیلے سے ہے جو آگ، پانی، ہوا وغیرہ پر مسدس کہہ کر مصائب نہیں جوڑتا۔ وہ شعوری طور پر کربلا کو مرکز بنا کر اس کے گرد مرثیے کا دائرہ کھینچتے ہیں۔ ان کے نزدیک مرثیہ نگاری اور عزاداری اجرِ رسالت ہے۔ جس کا تذکرہ انہوں نے اپنے مرثیوں میں بار بار کیا ہے۔

ع ادائے اجرِ رسالت غمِ حسینؑ میں ہے

ع ایسا نہ ہو کہ اجرِ رسالت ادا نہ ہو

ع اس سے وفا کرو کہ رسالت کا اجر ہے

لیکن ان کے مرثیے تقلیدی نہیں ہیں وہ اپنے مرثیوں میں اس بات سے غافل نہیں ہیں کہ آج کے مرثیے زندہ اور سنجیدہ موضوعات کے بغیر اجتہادی نہیں قرار پا سکتے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے علم کلام کے بہت سے مباحث چھیڑے ہیں۔ توحید، وجود خدا، دین و سیاست، حقیقت دین، مفہوم مذہب وغیرہ پر بہت سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مرکزی موضوع کے زیر سایہ ذیلی موضوعات کو بھی فنی خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ مثلاً ضمیر، موت، عمل، ذکرِ خدا، مفہوم بیعت اور قلم وغیرہ۔ اس سے ایک طرف تو انہوں نے یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ مرثیہ کی فضا کو منظر کی یکسانی سے بوجھل نہیں ہونے دیا۔ اس میں تنوع اور بوقلمونی پیدا کی اور دوسری طرف ان سارے ذیلی موضوعات کو کربلا پر منتج کیا ہے جو درحقیقت ان کی مرثیہ نگاری کا منشور ہے۔ وہ اپنے اس اقدام میں، بہت حد تک کامیاب ہیں۔

مصائب میں قدیم اساتذہ کے رنگ سے استفادہ محسوس ہوتا ہے۔ ان کی بیانیہ اور مکالماتی شاعری کے تیور وہی ہیں جو بہت پہلے سے مرثیے میں چلے آ رہے ہیں۔ البتہ مصائب میں زبانِ حال سے چند بیانات نظم کیے گئے ہیں وہ پُرشکوہ بھی ہیں اور جدید بھی۔

مجموعی طور پر شاداںؔ دہلوی کے مرثیے فنِ مرثیہ نگاری کی ایک محکم جہت کی تلاش ہیں اور کسی حد تک اس تلاش کی دریافت بھی ہیں۔ شاداںؔ مرثیے کے کامیاب ترین شاعروں میں سے ایک ہیں اور ان کا زیرِ نظر مجموعہ رثائی ادب میں ایک چونکا دینے والا اضافہ ہے۔

☆☆☆☆☆

کتاب۔ میرا اثاثہ

شاعر۔ سید آباد محمد نقوی زائر امروہوی

سن اشاعت: ۲۰۰۵ء

## مقدمہ

### حجۃ الاسلام خطیب عالم اسلام علامہ طالب جوہری مدظلہ العالی

جناب آباد نقوی زاد فضلہ، کا شعری مجموعہ میرے سامنے ہے جو حمد و نعت، سلام و منقبت اور قصائد و قطعات و رباعیات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ میں دو مختصر مرثیے بھی شامل ہیں اور کچھ ایسا کلام بھی ہے جو کسی وقتی تحریک کے زیر اثر لکھا گیا۔ مطالعہ سے پہلے صرف فہرست پر نگاہ ڈالنے سے ہمیں جناب آباد نقوی کی شاعری مختلف اصناف کے حوالے سے کثیر الجہات نظر آتی ہے اور یہ ان کی قدرتِ نظم کا ایک واضح اعلان ہے۔

حضرت آباد نقوی بذاتِ خود ایک تبرک ہیں اور سوز خوانی کے طبقۂ اعلیٰ کی باقیات الصالحات میں ہیں۔ میں کم و بیش تیس سال سے ان کی سوز خوانی سے مستفید ہوتا رہا ہوں۔ ایک مخصوص ترنم کی فضا میں لہجہ کا ٹھہراؤ، لفظوں کی ادائیگی میں نہ غیر ضروری زیر نہ نامناسب بم، کبھی کسی لفظ پر زور دینے کے لئے آواز کا چڑھاؤ اور کبھی مصرع کی ضرورت کے مطابق ہاتھوں کی جنبش۔۔۔ حضرت آباد کی خصوصیات ہیں لیکن میری معلومات کی حد تک آپ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اکثر و بیشتر سوز خوانی میں اپنے سلام و کلام کو پیش فرماتے ہیں۔

سوز خوانی کے متوازن اور طویل تجربہ نے ان کی شاعری کے عناصر ترتیب دیئے ہیں۔ یہ جملہ تھوڑی سی وضاحت چاہتا ہے اور وہ یہ کہ سامعین کے سامنے پڑھے جانے والے کلام کے سلسلہ میں پڑھنے والے کو اس بات کا فوری ادراک ہو جاتا ہے کہ شعر کو قبولیت ملی یا نہیں۔ ہم نے بہترین اشعار پر گاہے سکوت دیکھا ہے اور کبھی کم درجہ کے اشعار پر پھبتیں اڑتی دیکھی ہیں، ایک اچھے شاعر کا مسئلہ یہ ہے

کہ وہ اپنی سطح سے نیچے نہیں اُتر سکتا اور دوسری طرف صورتِ حال یہ ہے کہ اگر نیچے نہ اُترے تو شعروں کو پسندیدگی کی سند نہیں ملتی۔ جناب آباد نقوی کو اس صورتِ حال کا پورا ادراک ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں شعوری طور پر یہ کوشش کی ہے کہ ایسے مضامین نظم نہ کئے جائیں جنہیں سوچنے اور سمجھنے میں دیر لگے، الفاظ مشکل نہ ہوں، فکر گنجلک نہ ہو، بیان میں اغلاق نہ ہو اور شعری سطح عمومی سے بہت زیادہ بلند نہ ہو اور شعریت کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔

میں نے ان کی شعوری کوشش کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ ایسے مضامین نظم نہیں کرتے جن کو سمجھنے میں دیر لگے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی شاعری فکری رویوں سے خالی ہے اگر خالی ہوتی تو وہ ایسے شعر نہ لکھتے

دعوتِ قوسین میں آخر کیا کس جا قیام
لا مکاں میں بھی بنا ہے کیا مکانِ مصطفےٰ

امامت ضامنِ ختمِ نبوّت
محمد تا محمد سلسلہ ہے

یہ صاف قدر کے سورے سے ہو گیا ثابت
امامِ وقت کو حق کے پیام آتے ہیں

یقینی طور پر یہ فکری شاعری ہے لیکن ایسی نہیں کہ اُسے سن کر دماغ بوجھل ہو جائے اس لئے کہ اس شاعری کی ساخت ایسی لفظیات سے ہوئی ہے جو سامع کے دل میں مرادِ شاعر تک پہنچنے کی اُمنگ پیدا کرتی ہے اور یہ جناب آباد کی شعر نویسی کا ایک ممتاز رُخ ہے۔

جناب آباد نقوی کے اس مجموعہ کا مطالعہ کرنے والے یہ محسوس کریں گے کہ اس میں موضوعات کی کثرت ہے اور واقعہ یہ ہے کہ صرف فہرست پر نگاہ کرنے سے اس کا اندازہ ہو جاتا ہے لیکن یہ اس مجموعہ کا ظاہر ہے۔ اس کے باطن میں صرف ایک موضوع ہے اور وہ ہے خانوادۂ رسالت کے فضائل و مصائب کا بیان اس ضمن میں رسولِ اکرمؐ، جنابِ سیدہؑ اور ائمہ معصومینؑ کے علاوہ جناب ابوطالبؑ، خدیجۃ الکبریٰؑ، عباسِ علمدارؑ، جناب علی اکبرؑ، جناب علی اصغرؑ، کربلا کی دیگر شخصیات اور اس خانوادہ کے متوسلین

سلمانؓ، ابوذرؓ، فضہؓ اور قنبرؓ تک کے تذکرے ملیں گے۔ یہ صرف ممدوحین نہیں ہیں۔ یہ شخصیتیں آباد نقوی کا شعور ہیں ان کا عقیدہ ہیں ان کی سوچ ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو ان کے خون کے ہر ذرہ میں سانس لے رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اشعار میں ان کی مدح تذکرۂ مُردگاں کی صورت میں نہیں ہے بلکہ جیتے جاگتے انسانوں کی مدح ہے۔

اس مجموعہ کی خوبی فضائل محمدؐ و آلِ محمدؑ کا بکثرت بیان ہے۔ فضائل فضیلت کی جمع ہے اور فضیلت کے معنی ہیں اچھی صفت اور بلندئ مرتبہ۔ صاحبِ فضیلت وہ کہلاتا ہے جو دوسروں کی نسبت کسی خوبی کسی بلندی یا اضافہ کا حامل ہو۔ صفات کا حسن و قبح اضافی ہے ہو سکتا ہے کہ کوئی صفت یا خوبی کسی کے نزدیک اچھی ہو لیکن دوسرے کے نزدیک قبیح ہو لہٰذا فضائل کے لئے ایک ایسا معیار تلاش کرنا ہوگا جو اس الجھن کو دور کر کے کسی واضح قاعدہ کی نشان دہی کرے۔ اس کائنات کی سب سے بڑی فضیلت اللہ کی مرضی کا حصول ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وعد اللہ المومنین والمومنات جنّات تجری من تحتھا الانہار خالدین فیھا ومساکن طیبہ فی جنات عدن ورضوان من اللہ اکبر ذٰلک ھو الفوز العظیم (سورہ توبہ، ۷۱)۔ اللہ نے مومن مردوں اور عورتوں سے ایسی جنتوں کے وعدے کئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں پاک سکونت گاہوں کا بھی وعدہ ہے اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑا انعام ہے اور یہ بہت ہی بڑی کامیابی ہے۔ اللہ کی مرضی کو کائنات کی سب سے بڑی شے کہنے والا قرآن، رسول اکرمؐ سے یہ فرماتا ہے کہ: وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی (سورہ الضحیٰ، ۵) اور عنقریب تمہارا رب تم کو وہ کچھ دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے۔ یہ اس بات کا صریح اعلان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑا صاحبِ فضیلت اس کائنات میں نہ کوئی ہے نہ ہوگا اور نہ ہو سکتا ہے۔ اب رسول اکرمؐ کی ساری فضیلتیں آپ ہی کے حوالے سے استوار ہوں گی کہ آپ کس سے راضی رہے، اپنے اور دینِ حق کے حق میں کس کے مساعی پر خوش رہے اور کس کی تعریفیں بیان فرمائیں۔

ان حقائق کی روشنی میں بیانِ فضائل کے لئے تین ماخذوں سے استفادہ ناگزیر ہوگا اور وہ ہیں قرآنِ مجید، سنتِ رسولؐ اور عہدِ رسالت کی تاریخ۔ جناب آباد نقوی کی شاعری کے یہی تین ماخذ ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فضائل نظم کرنے والے دوسرے شعراء کے کلام کے ماخذ ان کے علاوہ ہیں۔ سارے فضائل نویس شعراء انہی ماخذ سے استفادہ کرتے ہیں اور ان استفادوں کو نفیس ترین پیرایوں میں نظم کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ جو آیات و روایات اور واقعات دوسرے شعراء کے یہاں تلمیح یا اشارہ کی صورت میں ہوتے ہیں آباد نقوی انہی بیانیہ انداز سے نظم کرتے ہیں تاکہ خورد و بزرگ اور جاہل و عالم بلکہ ہر سطح سماعت اس سے محظوظ ہو سکے۔

قرآن مجید کے حوالے سے ان کے یہ شعر قابل مطالعہ ہیں ہم صرف دو شعر نقل کر رہے ہیں جب کہ ایسے اشعار کثیر تعداد میں ہیں۔

هل اتیٰ سے فاطمہؑ زہرا یہ ثابت ہو گیا
عرش پر بھی ہے ترے گھر کے چلن کا تذکرہ
آیۂ تطہیر لائے دیکھ کر یہ جبرئیل
زیرِ چادر ہیں نبیؐ حسنینؑ، حیدرؑ، فاطمہؑ

اسی طرح روایات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے

یہ ثابت ہے حدیث مصطفیٰؐ سے
علیؑ مولا بنے حکمِ خدا سے
بجز آلِ محمدؐ ہر قرابت منقطع ہو گی
مسلسل حوضِ کوثر تک یہی اک سلسلہ ہو گا
اے نکیرین آ گئے مولا کرو مجھ سے سوال
دل قوی ہے اب مرا، دوں گا جواب اچھی طرح

ہمارے نقل کردہ اشعار میں سے ابتدائی تین اشعار میں آیت، روایت اور واقعہ کا لطیف امتزاج شعروں کی دلکشی میں اضافہ کا سبب ہے اب ذرا واقعاتی یا تاریخی اشعار پر بھی ایک سرسری نگاہ ڈالتے چلیں۔

جب الم نشرح ہوا شق القمر کا معجزہ — بن گیا شاہد نبیؐ کا ہو کے دو ماہِ مبیں
جنگ خندق اصل میں اک جنگ تھی احزاب سے — لشکروں کو کیا سمجھیں خود ایک لشکر ہیں علیؑ

علیؑ تو بھاگتے کی پشت پر نیزہ نہیں رکھتے   مُڑا یہ سوچ کر کافر یقیناً دوسرا ہو گا

شبِ ہجرت خریدا ہے خدا نے   علیؑ کا نفس خود اپنی رضا سے

میر انیس کی شاعری میں حفظِ مراتب کا اس قدر التزام ہے کہ تلوار اور گھوڑے کی تعریف سے پتہ چل جاتا ہے کہ ان کا تعلق معصوم سے ہے یا غیر معصوم سے۔ ہر دور میں ایسا التزام دیکھنے میں نہیں آیا۔ آباد نقوی کا یہ شعر حفظِ مراتب ایک اچھی مثال ہے۔

گیارہ معصوموں کی دادی کُل ایماں کی ہے ماں   رجس سے گویا بری ہیں فاطمہؑ بنتِ اسد

اس شعر میں ''گویا'' کا اضافہ معصوم اور غیر معصوم کے درمیان ایک نفیس خطِ فاصل ہے۔

آباد نقوی کی شاعری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ مشکل زمینوں میں آسان شعر لکھتے ہیں میری اس بات کی وضاحت کے لئے صرف تین مثالیں کافی ہیں۔

زیرِ دامانِ طہارت ہے ولایت کا چراغ
چھاؤں میں عصمت کی روشن ہے امامت کا چراغ

ہو گیا مہرِ نبوت سے قدِ آدم بلند
لَو لگاتے ہی رسالت سے امامت کا چراغ

حشر تک قائم رہے جن کے دیئے کی روشنی
سامنے ان کے جلے کس کی سخاوت کا چراغ

اسی طرح حیدر نصیب گوہر نصیب چمن کا تذکرہ پنجتن کا تذکرہ جواب اچھی طرح بوتراب اچھی طرح ردیف وقافیہ میں بڑے مستحکم اور کامیاب سلام لکھے ہیں۔ جناب آباد نقوی کی ہنرکاری یہیں ختم نہیں ہوتی۔ ان کے پاس شعر کو آراستہ کرنے کا بھی ایک سلیقہ ہے جسے وہ کبھی کبھی برتتے ہیں۔

رسولِ ربِّ عُلا ہیں فدا خدیجہؑ پر
رسولؐ ربِّ عُلا پہ فدا خدیجہؑ ہیں

رتبہ دانِ مصطفٰےؐ ہے یا خدائے ذوالجلال
یا علیؑ مرتضٰی ہیں رُتبہ دانِ مصطفٰےؐ

بعض مضامین جناب آباد نقوی کے پسندیدہ ہیں جنہیں وہ مختلف طریقوں سے نظم کرتے ہیں جن میں حدیث ثقلین، حدیث منزلت اور مباہلہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی انہوں نے مضمون برائے لیکن شگفتگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا مثلاً

پسر انہی کا ہے جو آخری محمدؐ ہے
جو تا ابد ہے وہ اک سلسلہ ابو طالبؑ
نواسہ اُن کا ہے جو آخری محمدؐ ہے
جو تا ابد ہے وہ اک سلسلہ خدیجہؓ ہیں

یا مثلاً

یہ انقلاب عجب ہے ادب کی دنیا میں
کو نکتہ رس بھی نہ تھا اب وہ نکتہ داں ٹھہرا
ادب کے شہر میں زائرؔ یہ کیسا انقلاب آیا
نہیں جو نکتہ رس بھی اب وہی بس نکتہ داں ٹھہرا

مجھے اس بات کا کوئی علم نہیں کہ آباد نقوی غزل سرائی کرتے ہیں یا نہیں لیکن ان کے سلاموں کے یہ چند اشعار قابل ملاحظہ ہیں:۔

پاس رہ کر جو مزاج شمع پہچانا نہیں
مدعی ہے عشق کا دراصل پروانہ نہیں
جتنی مے ملتی رہے پیہم سماتی ہی رہے
جو مے الفت سے بھر جائے وہ پیمانہ نہیں
اشک ہی تاثیر غم کا صاف دیتے ہیں ثبوت
جب نہ ہوں آنسو تو ثابت دل کا بھر آنا نہیں
صحبت صالح سے کیا حاصل کسی نا اہل کو
کب کوئی پتھر بنا جوہر کسی جوہر کے پاس

ہوا کرتے ہیں پتھر بھی ہر اک کان جواہر میں
مگر پتھر کوئی بنتے کبھی جوہر نہیں دیکھا

مجموعی طور پر جناب آباد نقوی کی شاعری اپنے موضوع کی اعتبار سے ایمان اور تقویٰ کی شاعری ہے اور اپنے معیار ترسیل کے اعتبار سے تعقید سے پاک اور لفظوں کے برمحل استعمال کی شاعری ہے۔

البتہ خال خال لفظوں کو ویسے نہیں باندھا گیا۔ جیسے وہاں ہیں۔ مثلاً

علیؑ، انگشتری، سائل، رکوع، خانۂ حق
یہ اہتمام تھا تنزیل انما کے لئے

مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ قارئین کے لئے وقیع اور باوزن ثابت ہوگا اور صاحبانِ ذوق اس کی کماحقہ پذیرائی کریں گے۔ میں درگاہ رب العزت میں دست بدعا ہوں کہ حضرت آباد نقوی کا سایہ تادیر قائم رہے اور وہ اسی طرح مدح خانوادۂ رسالت میں مشغول رہیں۔

طالب جوہری
یکم ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ

☆☆☆☆☆

کتاب۔ معراجِ سخن

شاعر۔ سید محمد سخن فتحپوری

سنِ اشاعت: ۲۰۰۷ء

# مظہرِ عقیدت

## قبلہ علامہ طالب جوہری صاحب مدظلہٗ

مولانا سید محمد سخن فتحپوری اعلیٰ اللہ مقامہٗ اُن بزرگوں میں تھے جن کا رشتہ علم دین اور شاعری (مدحِ محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام) سے یکساں تھا، مرحوم ایک صاحب بصیرت عالمِ دین اور باتقویٰ پیش نماز تھے لیکن ان کی شاعری قرار پائی جو عقیدت کا مظہر اور تعمق کی حامل تھی۔

لفظوں کا برمحل استعمال، لفظوں کے استعمال میں اسراف اور تبذیر سے پرہیز، سہل زبان، چست بندش اور قدرتِ خیال کی افراط مرحوم کی شاعری کے محاسن تھے۔

جب تک دنیا میں ذکرِ محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام باقی ہے اور اردو زبان قائم و دائم ہے جناب سخن فتح پوری کا کلام قارئین و سامعین میں ازدیادِ معرفت اور مرحوم کے لئے ازدیادِ درجات کا سبب قرار پائیں گے۔

☆☆☆☆☆

کتاب۔ مرثیہ "الحمد"

شاعر۔ ڈاکٹر ہلال نقوی

سن اشاعت: غیر مطبوعہ

# پیش لفظ

زمان و مکان کا فلسفہ جتنا دقیق اور پیچیدہ ہے، ان دونوں چیزوں کا احساس اتنا ہی آسان اور مشاہداتی ہے۔ کون سا ایسا انسان ہے جسے یہ نہ معلوم ہو کہ اس کے جسمانی وجود کی سمائی کے لئے ایک زمین (مکان یاSpace) لازمی طور پر درکار ہے اور اس کے موجود ہونے کے لئے ایک زمانہ بھی ضروری ہے جو نہ اس سے قبل موجود تھا اور نہ اس کے بعد موجود ہوگا۔ اس لئے کہ ایک مخصوص زمانے میں انسان کی موجودیت بتلاتی ہے کہ وہ قبل و بعد کے زمانوں میں موجود نہیں تھا۔ زمان و مکان دونوں مل کر ایک ایسا زندان تشکیل دیتے ہیں جس میں انسان محبوس ہے۔ اگر چہ دنیا کا ہر متحرک اور غیر متحرک موجود اس زندان کا زندانی ہے لیکن اس پر وہ ذمہ داریاں عائد نہیں ہوتیں جو انسان پر عائد کی گئی ہیں۔ اس کا سبب ایک تیسرا بُعد (Dimention) ہے۔ اور وہ ہے عقل۔ یہی عقل انسان کے لئے زبانیں تشکیل دیتی ہے، تہذیبیں بناتی ہے، رہن سہن کے طریقے ایجاد کرتی ہے اور عقلیات و ریاضیات سے لے کر فنون لطیفہ تک کے نت نئے شعبے ایجاد کرواتی رہتی ہے اور عہد بہ عہد زمانے اور زمین کے تقاضوں کے مطابق اس میں تبدیلی بھی کرواتی رہتی ہے۔

بیا آج سے ہزاروں سال پہلے جیسا گھونسلہ بناتا تھا آج بھی ویسا ہی بناتا ہے۔ لیکن انسان کی سکونت گاہ تبدیل ہوتی رہی ہے۔ اور وہ غاروں اور جھونپڑیوں سے ہوتی ہوئی قصور و محلات تک آ گئی۔ اسی طرح پیٹ کا ایندھن بننے کے لئے جو غذا جانور کی فطرت نے معین کی تھی وہ اس پر آفرینش کے آغاز سے آج تک قائم ہے۔ بر بنائے مثال آج تک کوئی شیر گھاس کھاتا ہوا اور کوئی گھوڑا گوشت کھاتا ہوا نہیں پایا گیا۔ اس کے برخلاف انسان کی لذت کام و دہن نے نت نئے پکوان ایجاد کئے۔ انسان اور حیوان میں جو فرق پائے جاتے ہیں وہ بدیہی ہیں اور ان فرقوں کو ایجاد کرنے والا وہی جوہر عقل ہے۔ جو ظاہری

(۱) راقم ڈاکٹر ہلال نقوی کا تہہ دل سے شکر گزار ہے کہ کتاب کی اشاعت کے قبل انھوں نے غیر مطبوعہ مضمون کا عکس عطا کیا اور کتاب میں شامل کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ [illegible]

اور باطنی حواس کی تربیت کا بھی کام کرتا ہے۔ اسی عقل نے ذہنی انسانی کو تجدد اور تنوع کے راستے دکھلائے۔ اگر ذہن انسانی میں تجدد اور تنوع کی اُمنگ نہ ہوتی تو انسان دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور ہوتا اور گرسودگی اُسے انسانیت کے دائرے سے باہر پھینک دیتی۔ ہم اس پوری گفتگو کا اشاراتی سورۂ حمد میں دیکھ سکتے ہیں۔ ہمیں سورۂ حمد سے مجموعی طور پر یہ سبق ملتا ہے کہ الحمد للہ رب العالمین میں مکان کی ربوبیت کی طرف اشارہ ہے۔ مالک یوم الدین میں زمانے کے تسلسل کی مالکیت کی طرف اشارہ ہے۔ اور ایاک نعبدو ایاک نستعین میں اشارہ ہے کہ انسان صاحب عقل ہے۔ یہ مختصری تمہید صرف اس لئے ہے کہ اس وقت میرے سامنے ہلال نقوی کا ایک مرثیہ ہے۔ جس کا عنوان الحمد ہے۔ اور ان کی خواہش ہے کہ میں اس پر اظہار خیال کے طور پر چند سطریں لکھوں۔

اس سے قبل میں نے اُن کے کچھ مرثیے دیکھے ہیں جن میں ہاتھ، چراغ اور آواز یقینی ہیں۔ کسی ایک لفظ کو یا اس کے مفہوم کو مرکزی حیثیت دے کر لطیف استعاروں، کنایوں، تشبیہوں کے ساتھ ساتھ تلمیحوں سے سجا بنا کر جو شعر لکھے جائیں گے وہ انتہائی پُرکشش اور لائق توجہ ہوں گے اور قاری یا سامع کے ذہن میں ایک طلسمی فضا بنا دیں گے۔ لیکن زیرِ نظر مرثیہ میں سورۂ حمد پر ایک مقالہ نظم کیا گیا ہے۔ جس میں خشکی پیدا ہونا یقینی تھا۔ لیکن حیرت کی حد تک یہ مرثیہ خشکی سے محفوظ ہے۔ قاری کو اگر کہیں خشکی محسوس ہو تو وہ موضوع کی سنجیدگی کے سبب ہوگی۔ شعریت اور سلاستِ بیان کے فقدان کے سبب نہیں۔

میں ہلال نقوی کو کئی دھائیوں سے جانتا ہوں۔ یعنی اُس وقت سے جب وہ بالکل نوجوان تھے۔ نوجوانی کی نوخیزیوں سے کون واقف نہیں ہے اُس کے زمین و آسمان اور ہوتے ہیں اور تقاضے بھی، رات چاندنی والی ہو یا گھٹا ٹوپ اندھیاری، دونوں کے اپنے اسرار و رموز ہوتے ہیں جنہیں نوجوانی کا موسم برتنے والے خوب جانتے ہیں لیکن ہلال نقوی کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی تھی۔ وہ یا تو صاحبانِ علم و فضل کی صحبت میں ہوتے تھے یا اپنے گھر میں تخلیق کے عمل میں مشغول ہوتے تھے۔ گویا انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی ہی میں اپنے آپ کو پالیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ آج اُن کا تحقیقی اور تخلیقی سرمایہ اتنا ہے کہ اگر وہ کچھ بھی نہ کریں تب بھی نام آوری کی فہرست میں ان کا نام درخشاں رہے گا۔

ان بیانات کے بعد جب اصل موضوع زیرِ بحث آتا ہے تو مرثیہ کے مختلف مقامات پر ایسے شعری

اشارات موجود ہیں جو بتلاتے ہیں کہ اس سنجیدہ موضوع پر شعر کہنے کے لئے انہوں نے اس سورۂ مبارک کی تفسیریں بھی دیکھی ہیں۔ صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں رحمان و رحیم تقریباً ہم معنی ہیں لیکن یہ بلاغت قرآن کے خلاف ہے کہ غیر ضروری طور پر ایک ہی مفہوم کے دو لفظ استعمال کئے جائیں۔ لہٰذا تفسیروں میں اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے کہ رحمانیت اس رحمتِ عامہ کی طرف اشارہ ہے جس کا عمل بلا تفریق پوری کائنات میں جاری و ساری ہے اور رحیمیت وہ مخصوص رحمت ہے جسے وہ اپنے پسندیدہ بندوں کے لئے مخصوص رکھتا ہے۔ مجھے اس کی تشریح خود آیات کی ترتیب سے سمجھ میں آتی ہے جو صاحبانِ علم کو ہدیہ کر رہا ہوں۔ الحمد للہ رب العالمین اور مالک یوم الدین کے درمیان میں الرحمان الرحیم ہے۔ ایک لفظ الرحمان، العالمین کے فوراً بعد ہے یعنی عالمین کی ربوبیت اس لئے کر رہا ہے کہ وہ رحمان ہے پھر لفظ رحیم ہے یعنی چونکہ وہ رحیم ہے اس لئے جزا کا دن (یوم الدین) وہ اپنے پسندیدہ اور خاص بندوں کو رحمت سے سرفراز فرمائے گا۔ اس مفہوم کو ہلال نقوی نے اپنے مخصوص شاعرانہ تیور کے ساتھ نظم کیا ہے۔

رحمان تا رحیم مباحث بھی ہیں ادق
جن کا نچوڑ یہ ہے بچے دفتر ورق
رحمانیت صفت ہے جو اک لطف عام کی
وصف رحیمیت ہے مگر خاص لطف حق

ایسے لطیف اور دقیق مفہوم کو جس مہارت کے ساتھ نظم کیا ہے وہ ہلال نقوی کا حصہ ہے۔

میں مرثیہ کی تعریف نہیں بلکہ تعارف کے طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ کربلا کے حوالے سے مسدس کی شکل میں لکھی جانے والی طویل نظم کا نام مرثیہ ہے۔ یعنی اس کی شناخت میں طویل موضوعاتی نظم کا حوالہ بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کربلا کا۔ ہمارے شعراء جب طویل موضوعاتی نظم لکھتے ہیں تو موضوع کے تقاضے کے پیش نظر اپنے شاعرانہ منصف کا حق کماحقہٗ ادا نہیں کرتے۔ موضوع کی طرف زیادہ متوجہ رہتے ہیں لہٰذا شعریت کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ خواجہ حالی کے مسدس کی اہمیت اور افادیت سے انکار ممکن نہیں ہے لیکن پڑھتے وقت بعض مقامات پر وہ طراوت اور دلکشی محسوس نہیں ہوتی جس کی ضرورت فن شعر میں تسلیم شدہ ہے۔ اس کے برعکس اقبال کا شکوہ اور جواب شکوہ اگرچہ دونوں ہی مسدس کی شکل میں ہیں اور ایک ارفع اور سنجیدہ موضوع پر

ہیں لیکن اقبال نے شعوری طور پر اس بات کا خیال رکھا ہے کہ شعریت مفقود نہ ہونے پائے۔ میں کہنا یہ چاہ رہا ہوں کہ ایسی نظموں میں الفاظ کا استعمال اتنا معقول اور خوشگوار ہونا چاہیے کہ قاری یا سامع تک شاعر کی مافی الضمیر کو بدرجہ اتم منتقل کر سکے اور اس کے ساتھ ہی شعریت کا دامن بھی نہ چھوٹنے پائے۔

ہلال نقوی کی تخلیقی فعالیت نے اس بات کو اچھی طرح سمجھا اور وہ زیر نظر مرثیہ میں اس سے بخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ انہوں نے گام بہ گام بندوں، بیتوں اور مصرعوں میں مصرع کاری کی صنعت استعمال کر کے اپنے مرثیہ کی شعریت میں بھرپور اضافہ کیا ہے۔ بالترتیب چند حوالے یہ ہیں۔

بند

اک شاخِ بے نہال میں کلیاں نکال دے
نخلِ خراب و خشک میں پھلیاں نکال دے
اُس کی طرف جو موسیٰ دوراں کوئی بڑھے
دریا کے بیچ شہر کی گلیاں نکال دے
دیوار و در کی طرح جو موجیں کھڑی رہیں
دریا میں ضربِ حق سے دراڑیں پڑی رہیں

بیت

یوں تہہ پہ تہہ تہوں سے جو رازِ دروں کھلا
ذرّے کی آنکھ پر فلکِ نیل گوں کھلا
نمرود شانِ جز میں کُل دیکھتا رہا
خارِ نظر سے محملِ گل دیکھتا رہا

مصرعے

جاتا ہے ماورائے نگہ بھی نگاہ کو
سطروں کی پالکی پہ سواری رواں ہوئی
روشن ہے جو لہو میں وہ قندیل ہے یہی

یہ چار مصرعے بھی میرے دعوے کی دلیل ہیں

دانش گہ ہے علیؑ و محمدؐ کی یہ سبیل
آبِ حیات، موجِ مُبیں، دجلۂ دلیل
شہپِ ثبات جادۂ جاں، خلعتِ خرد
اذنِ الہ، خلوتِ خوش، جلوتِ جلیل

یہ چند مثالیں بطور نمونہ ہیں مرثیہ ایسی شاعری سے بہت معمور و مزیّن ہے۔

طویل موضوعاتی نظم ہونے کے سبب مرثیہ ایک سنجیدہ تر صنفِ سخن ہے اس جملے سے میری مراد یہ ہے کہ ماہرِ فن اور تجربہ کار شعراء قطعہ اور غزل چلتے پھرتے کہہ سکتے ہیں لیکن بعض اصنافِ سخن شاعر کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتے ہیں مثلاً قصیدہ، طویل نظم اور مثنوی وغیرہ۔ ایسی اصنافِ سخن میں مشکل ترین مسئلہ مرثیے کا ہے۔ اس کا سبب موضوع کی وجاہت اور مسدس کی ہیئت ہے۔ اگرچہ قدیم ماضی کے اردو مرثیوں میں ہیئت کی تعیین نہیں تھی لیکن جس عہد میں مرثیہ نے اپنی شناخت پیدا کرلی اور شعری ادب میں قابلِ ذکر قرار پایا اس میں نہ صرف ہیئت کی پابندی کی گئی بلکہ اجزائے مرثیہ بھی معین ہوئے یعنی چہرہ، سراپا، مناظرِ فطرت، رخصت، رجز، جنگ، تلوار اور گھوڑا اور آخر میں مصائب کا تذکرہ۔ بعض حضرات نے ساقی نامہ بھی داخل کیا ہے۔ حسبِ ذوق ان اجزاء میں اضافے اور کمی کا رواج رہا۔ قدیم مرثیہ اپنی ہیئت اور اجزائے مرثیہ کی تالیف و ترتیب کا بھی جو نظام رکھتا ہو، جدید مرثیہ اپنی نئی راہیں تلاش کرنے کے باوجود اس نظام سے مکمل طور پر الگ نہیں ہے بلکہ جڑا ہوا ہے اس لئے کہ ماہر اور استاد شعراء اپنی روایت میں اجتہاد تو کرتے ہیں اس سے بغاوت نہیں کرتے۔

اجزائے مرثیہ کے سلسلے میں جدید مرثیہ کا معاملہ مختلف ہے۔ میرے مطالعہ کی حد تک یہ چار اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے یعنی چہرہ، موضوع، مصائب اور موخر الذکر دو اجزاء کو جوڑنے کے لئے گریز کے چند بند۔ قدیم مرثیوں میں گریز کا مسئلہ بہت اہم اس لئے نہیں تھا کہ مرثیے کی پوری صنف پر مرثیت اثر انداز رہتی تھی اور چونکہ اکثر مرثیے بیانیہ تھے اس لئے مصائب تک پہنچنا بھی آسان تھا۔ جدید مرثیہ میں گریز کے بند انتہائی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور ان سے شاعر کے کمال کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے کس مہارت کے ساتھ نتائج دیتے ہوئے کربلا کے ساتھ موضوع کا ربط قائم کیا ہے۔

ہلال نقوی تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس نازک ترین مرحلہ پر مرثیے کی فنی بصیرت کو بروئے کار لاکر سورۂ حمد ہی سے گریز کا رُخ نکالا ہے۔

ہو صاحب عمل تو شہادت کرے سلام
قائم رہے قدم تو اقامت کرے سلام
جس کا لہو بھی ورد کرے لا الہ کا
اس روح عبدیت کو عبادت کرے سلام
ایاک نعبدُ کا مکمل جواز ہے
خود آیتوں کو جس کی تلاوت پہ ناز ہے

اس تحریر کو اختتامی مراحل سے قریب کرتے ہوئے مسدس کے تیسرے مصرع پر ایک مختصری گفتگو نامناسب نہیں ہوگی یادش بخیر آج سے غالباً تیس سال پہلے مظفر پور (بہار) کے ایک گاؤں بھیکن پور میں جمیل مظہری صاحب سے ملاقاتیں رہیں جو ہفتوں پر مشتمل تھیں۔ گفتگو کے دوران میں نے مسدس کے تیسرے مصرع کے سلسلہ میں ان سے سوال کیا تو انہوں نے بلا تکلف جواب دیا کہ اس مصرع کو غیر مقید کرنے سے قافیہ کی تلاش کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور آسانی رہتی ہے میں نے عرض کیا کہ شاید معاملہ اس کے برعکس ہے، مسدس میں مقفّیٰ مصرع کہنا غیر مقفّیٰ کہنے کی نسبت زیادہ آسان ہے خصوصاً آپ جیسے قادر الکلام شاعر کے لئے۔ دوسری بات یہ کہ اس مصرع کو غیر مقفّیٰ کرنے سے حسن سماعت پر ویسی ہی ضرب لگتی ہے جیسے پٹاخے کی آواز سے۔ جمیل صاحب مرحوم نے جواب نہیں دیا مسکرا کر چپ ہو رہے۔

میں اس اجتہاد کی نفی یا اثبات پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ یہ ہلال نقوی کی رجحان طبیعت کا مسئلہ ہے لیکن جہاں جہاں انہوں نے تضمینوں کی صورت میں یہ عمل انجام دیا ہے اس میں یقیناً ایک لطافت اور معنی خیزی پیدا ہوئی ہے۔ جیسے اس مرثیہ میں ایک بند کے چار مصرعوں میں غالب کا شعر

ہیں اختیار کن کے عزائم نقاب میں
ہر گوشۂ جمال ہے قائم نقاب میں
آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

میں جب مرثیہ کا مطالعہ کرتا ہوا اس بند تک پہنچا:

کیا سلسلہ ہے دیکھو یہ مابین خشک و تر
مٹی سرشت تخم بنا اصل گل شجر
پھر بازو شجر سے ثمر پھر ثمر سے تخم
پھر تخم کو زمین کی لپک پھر نیا سفر
ہر امر رب کو داخل و خارج میں دیکھنا
اس کی ربوبیت کو مدارج میں دیکھنا

تو مجھے اپنا پہلا مرثیہ یاد آ گیا جس کا عنوان 'وجود خدا' تھا۔ میں نے غالباً انیس سو سرسٹھ میں اسے تحریر کیا تھا۔ اس کا ایک بند یہ ہے۔

جیسے کہ ایک بیج زمیں کے کنار میں
کونپل کا روپ دھار کے فصل بہار میں
مشغول کار تھا سفر برگ و بار میں
پھر بیج بن کے ما حصل کاشت کار میں
قانون ارتقاء کی تہیں کھولتا ہوا
صدیوں سے ہے دلیل تغیر بنا ہوا

میں نے اس مرثیہ میں سورۂ حمد اور سورۂ اخلاص کو بھی نظم کیا تھا ارادہ تھا کہ سورۂ حمد اور سورۂ اخلاص پر الگ الگ مرثیے لکھوں گا میں یہ کام نہ کر سکا اور ہلال نقوی اسے کر کے سرخرو ہوئے کہ کاتب تقدیر نے یہ کام انہی کی تقدیر میں تحریر کیا تھا۔

طالب جوہری

۲۲ فروری ۲۰۱۳ء / یکم ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ

☆☆☆☆☆

کتاب۔ درد کی قندیل

شاعر۔ فراست رضوی

سنِ اشاعت: ۲۰۱۴

# رباعیاتِ فراست پر ایک نگاہِ انتقاد

رباعیات کے زیرِ نظر مجموعے سے قبل بھی فراست رضوی کے شعری مجموعے شائع ہو کر قبولیت اور پسندیدگی کی سند پا چکے ہیں۔ وہ اپنی غزلوں میں ایک منجھے ہوئے غزل گو کا کردار بہت مہارت اور نفاست سے ادا کر چکے ہیں، لیکن یہ بات تعجب خیز اس لئے نہیں ہے کہ ہمارا دور سہل پسندی کا دور ہے اور غزل جیسی چیز چلتے پھرتے بھی کہی جا سکتی ہے۔ جہاں تک غزل کے معیار کا سوال ہے تو اس کا میزان خود شاعر کا اپنا معیارِ شعر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دوسری اصنافِ سخن جو صوری ہوں جیسے مخمس، مسدس، مثمن وغیرہ یا معنوی ہوں جیسے مثنوی، مرثیہ شہرآشوب اور دیگر منظومات، یہ شاعر سے زیادہ توجہ، انہماک اور وقت کی طلب گار ہوتی ہیں۔ اسباب جو بھی ہوں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پچھلی صدی کے آخری نصف سے شعراء کی قابلِ توجہ اکثریت غزل کے دائرے میں محدود ہو کر رہ گئی ہے، ایسے میں فراست رضوی کا چار سو رباعیات پر مشتمل ضخیم مجموعہ اردو کے شعری ادب میں بادِ مُراد کی نوید بھی ہے اور ایک خوشگوار تبدیلی کی اُمید بھی۔

اچھی غزل کے کافرانہ دلبری اور دل نوازی سے کوئی کافر ہی انکار کر سکتا ہے، اس کا ہر شعر اپنی ذات میں ایک مکمل سراپا ہوتا ہے کہ "وہیں عمر ساری بسر کیجئے"۔ غزل کے شعر اور رُباعی میں وحدتِ مضمون کے حوالے سے مماثلت پائی جاتی ہے اور دونوں کا تاثر بھی کم و بیش ایک جیسا ہوتا ہے لیکن غزل اس اعتبار سے خوش قسمت ہے کہ اوزان و بحور کی آزادی اُسے آسان بنا دیتی ہے۔ اس کے علی الرغم رُباعی کا ایک بڑا مسئلہ اس کے اوزان و بحور ہیں۔ بحرِ ہزج سے تعلق رکھنے والی اس صنف کو زحافات کے ذریعے سے کل چوبیس اوزان میں مقید کیا گیا ہے۔ اور اسی تناظر میں خواجہ حسن قطان خراسانی نے

اخراب و اخرام کے دو دوائر مرتب کئے اور فیصلہ کیا گیا کہ فقط انہی اوزان میں کہے جانے والے چار مربوط مصرعے رُباعی کہلانے کے حقدار ہوں گے۔ تفننِ طبع کے طور پر یہ جان لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ علمِ عروض کے بعض پہلوانوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ رُباعی کے مزید دس ہزار اوزان تشکیل دیئے جا سکتے ہیں۔ اور ایک منشی صاحب نے تو اس کے اسّی ہزار نو سو چوراسی اوزان نکالے بھی ہیں جو عروض کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں درست نہیں ہیں۔ یقیناً یہ اُس دور کی بات ہے جب اربابِ علم و فن کو فرصت کے رات دن میسر تھے۔

ہمارے عہد میں بھی ایسی چند کوششیں کی گئی ہیں۔ بھارت میں علامہ سحر عشق آبادی اور اُن کے ہونہار شاگرد روز ارعلامی نے معاقبہ یعنی مفعول = فاعلن کو کام میں لاتے ہوئے رُباعی کے بحور کی تعداد ۱۵۴ تک کر دی۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ چونکہ مفعول اور فاعلن مرکب زحاف ہیں، لہٰذا اُن کے مابین معاقبہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے ان سو ساختہ اوزانِ رباعی کو مستند عروض دانوں سے رد کر دیا۔

اُستادانِ عروض کے یہ سارے دعوے رُباعی کی ظاہری شکل و صورت کے بارے میں ہی، جب کہ اس کی معنوی کیفیات پر نگاہ ڈالی جائے تو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ ایک ایسی مکمل ترین نظم ہے جو اپنی جسامت میں مختصر ترین ہونے کے باوجود اپنے اندر اظہار کی بے کنار وسعتیں رکھتی ہے۔ رُباعی کے نکتہ شناس اور تخلیق کار جانتے ہیں کہ اس صنف میں سب سے مشکل کام چوتھا مصرعہ کہنا ہے۔ رباعی میں تین ابتدائی مصرعے ایک مخصوص فکر کے لئے تشریحی مواد فراہم کرتے ہیں اور چوتھے مصرعے میں وہ مخصوص فکر ظہور پذیر ہو کر رُباعی کی معنوی تکمیل کرتی ہے۔ اگر چوتھا مصرع کمزور ہو تو رُباعی کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ ہماری بعض مقامی زبانوں کے لوگ ادب میں ایسی غنائی اصناف موجود ہیں جن میں پہلا مصرع بات کے آغاز کرنے اور ایک قالب مہیا کرنے کے لئے لکھا جاتا ہے، بھلے یہ پہلا مصرع مہمل بھی ہو سکتا ہے۔ خصوصاً پنجابی ماہیے اور ٹپے میں اس تکنیک کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن رُباعی میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کے چاروں مصرعوں میں ایک معنوی ربط پایا جانا ضروری ہے۔ بہر حال، فارسی اور اردو میں یہی طریقہ مروّج رہا ہے کہ مضمون کا ابلاغ اور تکمیل رُباعی کے آخری دو مصرعوں میں کی جائے۔

جیسے سحابی استر آبادی کے یہ دو مصرعے:

دریا بوجودِ خویش موجے دارد

خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

رُباعی اگرچہ فارسی زبان کی ایجاد ہے لیکن اردو نے اسے دوسری اصناف کی طرح بہ رضا و رغبت قبول کیا ہے لیکن اس خصوصیت کے ساتھ کہ یہ ہمیشہ سے ثقہ افراد اور خواص کی پسند رہی ہے۔ اگر فارسی کی شعری روایت میں رباعی نگاروں کا مطالعہ کیا جائے تو نورالدین عوفی کے لکھے ہوئے فارسی کے قدیم ترین ادبی تذکرے (سنِ تالیف ۶۱۸ھ) "لباب الالباب" کے مطابق سلجوقی عہد صنفِ رُباعی کے لئے بڑا ہی زرخیز تھا۔ گو اس سے قبل عنصری اور فرخی کی چند رُباعیات ملتی ہیں۔ لیکن سلجوقی عہد نے جو رباعی گو پیدا کئے، دنیا آج بھی اُن کے فن کی معترف ہے۔ اس عہد میں ہمیں ابوسعید، عمر خیام، طوسی سمرقندی، نظامی گنجوی، انوری، خاقانی اور سنائی جیسے اکابر رُباعی ملتے ہیں جنہوں نے آسمانِ ادب پر رُباعی کے ماہ و نجوم سجا دیئے۔ بابا طاہر عریاں ہمدانی بھی اسی دور سے متعلق ہیں مگر ان کی چہار مصرعی نظمیاتی اکائیوں کو رُباعی کہنا صحیح نہیں ہے کیوں کہ وہ رُباعی کے مخصوص اوزان میں نہیں ہیں۔ سرمد فارسی ادبیات کی تاریخ کا وہ آخری عظیم رباعی نگار ہے جسے خیام اور ابوسعید ابوالخیر کا ہم پلہ کہا جا سکتا ہے۔

قدیم ایران میں انہیں لحن اور سریلی آوازوں میں پڑھا جاتا تھا جس سے اہلِ بزم کیف و سرور حاصل کرتے تھے۔ غالباً اسی خصوصیات کے سبب اہلِ فارس نے اسے "ترانہ" کا نام دیا ہے۔ اور میں رُباعی کی مقبولیت اور رواج کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ کسی بھی دور میں عوامی سطح پر بہت زیادہ مقبول صنفِ سخن نہیں رہی۔ زمانۂ گزشتہ میں نول کشور اور دوسری مطابق سے چھپنے والے دواوین میں محض رُباعی کے مجموعے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اُس عہد کے غزلوں کے مجموعوں کو دیکھئے تو اُس میں یا تو رُباعیات ہیں نہیں یا اگر ہیں تو بہت کم۔

اس صنف میں صرف انہی شاعروں سے طبع آزمائی کی ہے جن کی فطرت میں خداوند کریم نے مشکل پسندی ودیعت کی ہے۔ اس کا یہ مطلب یقیناً نہیں ہے کہ اردو کے اکابر شعراء نے اس صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ ولی دکنی، انشاء، مصحفی، میر، سودا، مومن، درد، غالب، ذوق اور نظیر اکبرآبادی وغیرہ کے دواوین میں اعلیٰ درجے کی رُباعیاں موجود ہیں۔ مگر ان کی انتہائی کم تعداد ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے

کہ یہ ان شعراء کے مرغوب صنفِ سخن نہیں ہے۔ اس عہد میں ہمیں انیس و دبیر کے نام رُباعی کے حوالے سے بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس دو بزرگ شاعروں کی اس ادبی خدمت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ انہوں نے اس خواص پسند صنف کو منبروں کے ذریعے عوامی بنانے میں نہایت اہم کردار انجام دیا ہے۔ بعد کی رُباعی گو شعراء میں رُباعی کی بقاء اور ارتقاء کی بے حد سنجیدہ کوششیں نظر آتی ہیں جنہیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ رُباعی کے عہد جدید میں جو اہم شعراء ہیں، اُن کے نام یہ ہیں:

خواجہ الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی، شاد عظیم آبادی، پیارے صاحب رشید، شوق قدوائی، عزیز لکھنوی، فانی، اثر لکھنوی، امجد حیدر آبادی، یاس یگانہ چنگیزی، جگت موہن لال رواں، تلوک چند محروم، آنند نرائن مُلا، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، جوش، فراق، سیماب اکبر آبادی، راغب مراد آبادی، عبد الباری آسی، آغا شاعر قزلباش، پروفیسر شعور علیگ، فدا خالدی، اقبال شوقی، اثر صہبائی، نریش کمار شاد، عنوان چشتی، شمس الرحمٰن فاروقی، صفیہ شمیم ملیح آبادی، اجتبیٰ رضوی، صادقین، محسن اعظم ملیح آبادی اور رفیع الدین راز۔

شعر و ادب میں رُباعی کے کردار کو اس وقت تک متعین نہیں کیا جا سکتا، جب تک اس کے موضوعات کا جائزہ نہ لیا جائے۔ ایک طائرانہ جائزے کے مطابق الٰہیات، مابعد الطبعیات، تصوف، فنا و بقاء، حیات و ممات، خمریات و متفرق ذوقیاتی مسائل کے ساتھ ساتھ احساسات، جذبات اور عقلیات کی لطیف ترجمانی اس کے اساسی موضوعات رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ دقیق اور سنجیدہ مسائل پر رُباعی گو شعراء نے فکرِ انسانی کو جتنا کچھ دیا ہے، وہ ناقابلِ فراموش ہے۔

موضوعات کی متانت اور سنجیدگی کے فطری تقاضے کے طور پر رُباعی کے لئے یہ لازم قرار پایا کہ مذکورہ موضوعات کے بیان کے لئے ایسے الفاظ منتخب کئے جائیں جو خود بھی متین اور سنجیدہ ہوں اور ایک باوقار فکری فضا کو تشکیل دینے پر قادر ہوں۔ رودکی (وفات ۳۲۹ھ) سے شروع ہونے والی یہ صنفِ سخن جب اپنے سفر پر روانہ ہوئی تو اپنے موضوعات، اسالیب بیان اور انتخاب الفاظ میں ٹھیٹھ روایتی اور بندھے ٹکے اصولوں کی شاعری تھی۔ اگر ہزار سال کے دورانیے میں کہیں روایت سے انحراف بھی ملا تو وہ اتنا کم تھا کہ قابلِ ذکر بھی نہ تھا۔ اگر فراق و جوش اس میدان میں وارد نہ ہوتے تو یہ انحراف ناقابلِ ذکر ہی

رہتا۔ فراق و جوش کی رُباعیاں مذکورہ روایات سے جزوی لیکن نمایاں انحراف اور رُباعی کی زبان، اسلوبِ بیان اور موضوعات میں واضح تنوع اور توسیع کی بہترین نمائندہ رُباعیاں ہیں۔ فراق کی جسیاتی اور صنفیاتی رُباعیوں میں اُن کا ہندی اور اردو کا ملا جلا اب ولہجہ انہیں رُباعی گو شعراء میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے۔ جوش صاحب کا مسئلہ اُن سے مختلف ہے، لیکن ایک قدر مشترک بہر حال دونوں میں پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ ان دونوں شعرائے عظام نے اردو رُباعی کو انتہائی دلچسپ اور پُرکشش بنایا اور اس کی عام مقبولیت میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔

حضرت جوش عجوبۂ روزگار تھے اور عجوبۂ روزگار رہیں گے۔ تین اصنافِ سخن پر اُن کی قدرتِ کلام اتنی مساوی ہے کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ اُن کا اصل رُجحانِ طبع کیا تھا اور وہ ہیں بیانیہ اور خطابیہ نظمیں، مراثی (مسدس) اور رُباعیات۔ جب ہم اُن کی رُباعیات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں کم و بیش وہ سارے موضوعات نظر آتے ہیں جو متقدمین کے افکارِ عالیہ کا محور رہے ہیں۔ وجودِ باری، ذات و صفات کے مسائل، مسئلۂ جبر و قدر، تشریع و تکلیف، زمان و مکاں، عقل و عشق، گناہ و ثواب، محبوب کا سراپا، مناظرِ فطرت اور رندی و زہد کے موضوعات جوش صاحب کی رُباعیوں میں بڑی کامیابی سے ادا ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں نفسیاتی مسائل، ایک مخصوص انداز، خیام کی طرح کا طنز اور بعض مقامات پر تمسخر اور ناپسندیدہ استہزاء، غرض اُن کی رباعیات میں موضوعات کی ایک رنگا رنگ دنیا آباد ہے۔ اس پر مستزاد اُن کا پُرشکوہ لہجہ اور الفاظ و اصوات کا جمال۔ ان تمام فنکارانہ خوبیوں نے جوش ملیح آبادی کو اردو رُباعی کا بے تاج بادشاہ بنا دیا ہے۔ بلاشبہ رُباعی کے میدان میں اُن کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ موضوعات کی اتنی بوقلمونی ہمیں کہیں اور دکھائی نہیں دیتی۔ میں آج بھی ''نجوم و جواہر'' کو اردو رُباعی کا سب سے بڑا اور اہم ترین مجموعہ تسلیم کرتا ہوں۔

رُباعی پر یہ حکایت ذرا طویل ہوگئی ہے۔ اب ہم بانگو زدہ اور غزل خوردہ فراست رضوی کی رُباعیات پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ رُباعی سے فراست رضوی کا تعلق کتنا گہرا ہے لیکن اتنا معلوم ہے کہ انہوں نے جوش صاحب کی علمی اور ادبی صحبتوں سے بھرپور فیض حاصل کیا ہے۔ وہ اپنی کم عمری ہی میں اچھی رُباعی کہنے پر قادر تھے اور جوش صاحب سے داد و تحسین وصول کرتے رہتے تھے۔

میں نے فراست رضوی کی رُباعیات کے مسودے کو بہت انہماک اور شوق سے پڑھا ہے۔

فراست کی رُباعیاں اتنی دلچسپ، فکر انگیز اور خیال پرور ہیں کہ وہ ایک سنجیدہ قاری کو بھرپور توجہ اور عمیق مطالعے پر مجبور کردیتی ہیں۔ فراست رضوی اگرچہ بہت سنجیدہ عمر کے انسان نہیں ہیں لیکن اُن میں حاضر جوابی اور خوش مزاجی کے ساتھ ساتھ بلا کی سنجیدگی بھی پائی جاتی ہے۔ یہ اودھ کی اُس زرخیز تہذیب کی عطا ہے جس میں اُن کی زندگی کی کونپل پھوٹی تھی۔ گہرا شعور، دردمند دل اور حساس طبیعت فیاضِ مطلق کا فیض ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں جن سے اُن کی طبیعت کا خمیر اُٹھا ہے اور انہیں عناصرِ ثلاثہ سے ان کی شاعری صورت پذیر ہوئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی فنکار کی تخلیق کو اُس کی تکوین سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ اب ہم ان معروضات کی روشنی میں جستہ جستہ اُن کی رُباعیات کا جائزہ لیتے ہیں۔

اُڑتے ہوئے بادلوں سے آئی ہے ہوا
برسات کے آنچلوں سے آئی ہے ہوا
بھیگی ہوئی گھاس کی سی خوشبو لے کر
پھر بانس کے جنگلوں سے آئی ہے ہوا

☆

کچھ کام نہیں ہجر کے مقتولوں کو
بھولا نہیں ساون میں پڑے جھولوں کو
بچپن کا پرانا گھر یاد آتا ہے
جب دیکھتا ہوں موگرے کے پھولوں کو

☆

چلمن کے وہ ڈورے مجھے یاد آتے ہیں
مٹی کے سکورے مجھے یاد آتے ہیں
جب آتی ہے گرمی کی جھلستی شامیں
چاندی کے کٹورے مجھے یاد آتے ہیں

☆

یخ بستہ ہے ماہِ زرد اور رات طویل
افسردہ ہوائے سرد اور رات طویل
کیا جانے سحر تک میں رہوں یا نہ رہوں
بڑھتا ہوا دل کا درد اور رات طویل

موسم، منظر اور مزاج کی دردمندی کے امتزاج سے پیدا ہونے والی یہ اور اس جیسی دوسری رُباعیاں اس بات کی دلیل ہیں کہ فراست خارجیت کے منظروں سے داخلیت کے نیم روشن عکس تراش لینے والے کامیاب سخن ور ہیں۔ وہ مشاہدے کو احساس میں تبدیل کرنا جانتے ہیں۔ اور یہ کرشمہ زائی انہیں اس لئے میسر آئی ہے کہ ان کے پاس ایک ایسا دل ہے جو وسیع معنوں میں دردمند ہے اور انسانی اقدار سے محبت رکھتا ہے۔ اور وہ خود بھی اس حقیقت کے معترف ہیں۔

میں عقل کے صحرا میں اکیلا تو نہیں
اک دوست مرے ساتھ ہے دل کی صورت

فراست رضوی کی رُباعیات سے پوری طرح حظ حاصل کرنے کے لئے مذکورہ بالا شعر کی ایک ترکیب کا سہارا لینا ہوگا اور وہ ہے عقل کا صحرا۔ یہ ترکیب اپنے اندر فلسفے کے مثالیت پسند مکتب میں پائی جانے والی عقل کی تعریف کا اظہار کرتی ہے۔ عقل کی فلسفیانہ تعریف غزالی اور معتزلہ کے افکار سے لے کر عمیونول کانٹ تک ایک بے سمت، خارزار صحرا کے سوا اور کیا ہے۔ جس میں استدلال اور آگہی کے دکھ پھیلے ہوئے ہیں۔ رئیس امروہوی نے اس موضوع پر کمال کا شعر لکھا، "شاید اُسے عشق بھی نہ سمجھے جس کرب میں عقل مبتلا ہے"۔ فراست رضوی وسیع المطالعہ اور فلسفیانہ مباحث سے آشنا فنکار ہیں، لہٰذا گمان غالب ہے کہ اُن کا بیشتر وقت عقل کے صحرا کی سیر کرتے بسر ہوتا ہوگا، اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اُس رُباعی کا جواز کیا ہے؟

موجودِ مبہم کی نشانی کی تلاش
دنیا میں جوازِ عمرِ فانی کی تلاش
لایعنی شب و روز میں کرتے ہی رہے
ہم اپنے وجود کے معانی کی تلاش

اس رباعی میں شاعر اپنے وجود کے معنی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ لیکن اُسے دیانت داری کے ساتھ یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ اس سے قبل بھی بہت سے اہلِ تفکر گزرے ہیں جنہوں نے نامعلوم زمانوں سے آج تک غایتِ وجود اور معنی وجود کی تلاش کی ہے۔ فراست کو اس حقیقت کا مکمل ادراک ہے اور انہوں نے اس مضمون کو درج ذیل رُباعی میں ادا کیا ہے:

ذہنوں کو جمود سے بچانے والے
دانش کو نئی راہ دکھانے والے
رُک سکتا نہیں علم کی وسعت کا سفر
جب تک ہیں سوالات اُٹھانے والے

بہت سے فکری حلقوں سے جب یہ آواز اُٹھی کہ فلسفے نے کسی انسانی مسئلے کا کوئی حل پیش نہیں کیا اور یہ صرف بڑی بڑی اصطلاحات اور پیچیدہ افکار کا ایک گورکھ دھندا ہے۔ یعنی فلسفہ ایک ذہنی عیاشی ہے تو اس کے جواب میں حامیانِ فلسفہ نے یہ جواب دیا کہ فلسفے کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ فلسفے نے ذہن انسانی میں کائنات، خدا اور انسان کے حقائق و دقائق کے سلسلے میں سنجیدہ سوالات پیدا کئے۔ فلسفے کے اس عملی کردار سے واقعتاً انکار ممکن نہیں ہے۔ اب اِن سوالات کے جواب میں تیقن پیدا ہو، یا تشکیک یا حیرت، فلسفہ ان رویوں میں ہمیشہ غیر جانب دار رہا ہے۔ فراست کی رُباعیوں میں یہ تینوں رویے حسبِ تفہیم جھلملاتے نظر آتے ہیں۔

رشتہ تھا بھروسے کا جسے توڑ گئی
اِک کوچۂ حیرت سے مجھے جوڑ گئی
نکلی تھی حقیقت کے سفر پر ہم راہ
رستے میں مگر عقل مجھے چھوڑ گئی

☆

آئینۂ اوہام نہ ٹوٹے مجھ سے
تشکیک ترے دام نہ ٹوٹے مجھ سے

پتھر کے خداؤں سے تو جاں چھوٹ گئی
افکار کے اصنام نہ ٹوٹے مجھ سے

☆

دنیا سے نہ دل لگاؤں کامل رہ جاؤں
طوفاں نہ بنوں صورتِ ساحل رہ جاؤں
وہ علم جو انکارِ خدا کرتا ہے
اُس علم سے بہتر ہے کہ جاہل رہ جاؤں

تیقّن کی کیفیت انسان کی شخصیت میں ایک اثر اور فسوں پیدا کر دیتی ہے۔ یہ یقین ہی کی روشنی ہے جو ہمیں نامعلوم منزلوں کا راستہ دکھاتی ہے۔ اور یہ بات سچ ہے کہ تیقّن کا اصل ذریعہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ اُس قادرِ مطلق پر بھروسا کرنا اور اپنے وجود کے پاتال میں اُتر کر اپنے آپ کو پالینا ایک بڑا روحانی تجربہ ہے۔ اقبال نے اسے ایک لفظ 'خودی' سے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وہ عرفانِ ذات ہے جو ہمیں ذاتِ باری تعالیٰ کے نہاں خانۂ راز تک لے جاتا ہے۔ جہاں تک فراست کے تیقّن کا تعلق ہے تو اُس کی رباعیوں میں جو تیقّن نظر آتا ہے، میرے نزدیک اُس میں قرآن فہمی کا کچھ کرشمہ بھی شامل ہے۔ مثلاً یہ رُباعیاں۔

کیا آب و شجر، کوہ و بیاباں ساقی
مٹ جائیں گے سب خال و خطِ آفاقی
ہر چیز فنا کے گھاٹ اُتر جائے گی
رہ جائے گا اللہ کا چہرہ باقی

☆

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو جانا
مالک سے تم اپنے نہ خفا ہو جانا
سب طبل و علم، جاہ و حشم عارضی ہے
باطل کی ہے تقدیر فنا ہو جانا

آپ نے دیکھا سورۂ قصص کی آیت نمبر ۸۸ "اُس کے چہرے کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ اُسی کا حکم ہے اور اُسی کی طرف تم لوٹ کر جاؤ گے۔ اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۸۱ "اور کہہ دو کہ حق آ گیا اور باطل نابود ہو گیا، بے شک باطل نابود ہونے والا ہے" ان آیات کا مقصود کلام کو فراست نے کتنی رعنائی کے ساتھ اپنی رباعیوں میں سمویا ہے۔ ابھی ابھی میں فراست رضوی کی رباعیات میں تیقن کے حوالے سے کچھ بات کر رہا تھا۔ اسی تیقن کا ایک پہلو یہ بھی ہے جو انہیں قدیم یونانی نظریہ بقائے روح کو قبول کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ نظریہ بعض قدیم مذاہب اور اہلِ تصوف میں بھی مقبول ہے۔ اقبال نے اس مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے:

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے حیات کے مرکز کو چھو نہیں سکتا

فراست کی رباعی اس موضوع پر ایک بہت مکمل اور جمالیاتی رنگ سے آراستہ ہے:

بالائے مہ و سال و صدی ہوتا ہے
یہ ایک چراغ سرمدی ہوتا ہے
مرتا نہیں یہ جسم کے مر جانے سے
انسان کا جوہر ابدی ہوتا ہے

یونانی حکماء نے کائنات میں تغیر کے اصول کو بڑی وضاحت اور استدلال کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان حکماء میں ہرقلیتیس افیسی (Heraclitus Ephesus - 484 BC) کا نام سرِفہرست ہے۔ جس نے سب سے پہلے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا اور کہا کہ یہ کائنات مسلسل تغیر کی زد میں ہے اور اس قانونِ تغیر کا نام اُس نے لوگوس (Logos) بتایا۔ اُس نے کہا، کائنات میں محض تغیر کو ثبات ہے۔ ہرقلیتیس کا مشہور فقرہ ہے کہ انسان ایک پانی میں دوبارہ پاؤں نہیں ڈال سکتا۔ آج جدید سائنس کی حیرت زدہ کر دینے والی ترقی کے باوجود یہ فلسفیانہ نکتہ اوّل دن کی طرح آج بھی درست اور ایک بڑی تکوینی اور آفاقی حقیقت کا عکاس ہے۔ میں سمجھتا ہوں بہت سے عالم گیر مسائل ایسے ہیں جن پر انسان ایک ہی طرح سوچتا ہے اور ایک ہی نتیجے تک پہنچتا ہے۔ فرق صرف اسلوب بیان کا ہوتا ہے۔ "درد کی قندیل"

میں فراست رضوی اپنے اُسلوب بیان کو متعین کرنے میں کامیاب ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہ نظریہ کہ "ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں" فراست نے اپنے منفرد اسلوب میں یوں نظم کیا ہے:

آنکھوں میں نہیں کچھ بھی تحیر کے سوا
جاتے ہوئے لمحوں کے تصور کے سوا
بدلے گا نہ دستور بدل جانے کا
ہر شے میں تغیر ہے، تغیر کے سوا

اگر تغیر ثابت و دوائم ہے تو ثبوت و دوام کے وجود کو مستقل فرض کرنا ہوگا جو تغیر پر طاری ہے۔ اگر ثبوت و دوام کا وجود مستقل ہے تو وہ تغیر کے علاوہ کسی دوسری شے پر بھی طاری ہو سکتا ہے۔ لہٰذا صرف تغیر کو دائمی ماننا محلِ نظر قرار پائے گا۔ میرے کسی شعری مجموعے میں ایک مختصر سی نظم ہے جس کا مرکزی خیال یہی نکتہ ہے کہ اگر ہر شے میں تغیر ہے تو تغیر بھی ایک شے ہے جو خود بھی کبھی بدل سکتی ہے اور لاتغیر میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ مُلّا صدرالدین شیرازی نے اس بحث کو بہت عمدہ طریقے سے علت العلل کے تصور سے جوڑا ہے۔ علامہ اقبال کے ایک خط کے جواب میں مشہور دینی اور روحانی عالم حضرت پیر مہر علی شاہ صاحبؒ نے جو مکتوب نما رسالہ تحریر کر کے اقبال کو بھجوایا تھا، اُس میں زماں کی بحث میں یہ موضوع کئی نئے فکری زاویوں کے ساتھ آیا ہے۔ بہر حال یہ ایک خالص تجریدی بحث ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع ومقام نہیں اور فراست تو پہلے ہی اپنے لئے ایک راہِ نجات تلاش کر چکے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

ہاں خوف و ہراس کے ہیں قیدی ہم لوگ
زنجیرِ قیاس کے ہیں قیدی ہم لوگ
باہر کے مناظر کی خبر کیا ہم کو
زندانِ حواس کے ہیں قیدی ہم لوگ

رُباعیات کا یہ مجموعہ اس لحاظ سے متنوع اور رنگارنگ ہے کہ خالص احساساتی اور عقلیاتی مسائل کے ساتھ بین الاقوامی سیاست، مشرق ومغرب کا تصادم، ہولناک جنگیں، معاشرتی اُلجھنیں، تہذیبی پیکار جو اس صدی کے انسان کا مقدر ہے، عصری مسائل اور سماجی آگہی کی بے شمار شعری تصویریں اس کے صفحات پر بکھری ہوئی ہیں:

گم گشتہ شناخت کی تلاشوں کو سلام
طبل و علم و جنگ کے تاشوں کو سلام
تو گرگِ یہودی سے نبرد آزما ہے
مشرق ترے چہرے کی خراشوں کو سلام

☆

کم زوروں کے مقسوم بنانے والے
تاریخ کو مغموم بنانے والے
آزادیِ انساں کے محافظ ٹھہرے
اقوام کو محکوم بنانے والے

☆

آہستہ خرامی سے نہ باہر نکلے
افکار کی خامی سے نہ باہر نکلے
آقا تو گئے چھوڑ کے کب کا ہم کو
ہم ہیں کہ غلامی سے نہ باہر نکلے

☆

فراست رضوی جس معاشرے میں سانس لے رہے ہیں، اُسے نہ پورے طور پر صنعتی کہا جا سکتا ہے، نہ زرعی اور نہ تجارتی۔ یہ ایک نیم مغربی اور نیم دینی معاشرہ ہے جہاں بیک وقت جمہوریت کی مدح سرائی بھی ہے اور پاکستان کے آئین کے حوالے سے قراردادِ مقاصد کی بالادستی بھی ہے۔ عملی طور پر دیکھیے تو یہ ایک بے رحمی اور بددیانتی کا معاشرہ ہے جو مفادات کے تصادم کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ جہاں قدم قدم استبداد اور تضادات کے ستون کھڑے ہیں اور چھوٹی بڑی خوں ریز جنگیں بھی اسی کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں:

غارت گری و جنگ کی عادت نہ گئی
افراد کی افراد سے نفرت نہ گئی

کیا کیا نہ کیے علم و ہنر میں اعجاز
لیکن دلِ انساں کی شقاوت نہ گئی

☆

یہ دیکھ کے ہوں غم کے خرابوں میں اسیر
بینائی کے ٹوٹے ہوئے خوابوں میں اسیر
ہیں تیسری دنیا کے ستم کیش عوام
سرمایہ پرستی کے عذابوں میں اسیر

☆

افسردہ ہے امن کا پرندہ اب تک
خوں ریزی جبلت میں ہے زندہ اب تک
تہذیب و ترقی بھی نہ کر پائی تمام
انسان کے اندر کا درندہ اب تک

☆

دنیا کو جہالت سے بچاؤ پہلے
افلاس کے اسباب مٹاؤ پہلے
پھر عظمتِ انساں کا قصیدہ پڑھنا
اِن جنگ کے شعلوں کو بجھاؤ پہلے

درج بالا رباعیاں ہمیں اس نام نہاد گلوبل معاشرے کا اصل چہرہ دکھاتی ہیں۔ عالمی معاشرے کی بہیمیت اور درندگی کو فراست نے بڑے قرینے اور وضاحت سے اپنی رباعیوں [illegible] جگہ [illegible] انھوں نے اپنے شہر کے حالات کو بھی فراموش نہیں کیا ہے۔ ایک رباعی میں وہ اپنے شہر کا نقشہ [illegible] ہوئے لکھتے ہیں:

اک خوف رگ و پے میں بسا ہو جیسے
عفریت ہمیں ڈھونڈ رہا ہو جیسے

وحشت کا ہے آسیب گلی کوچوں میں
یہ شہر بھی اک دشتِ بلا ہو جیسے

الغرض زیرِ نظر مجموعۂ رباعیات "دردکی قندیل" ایک بھرپور اور مضبوط مجموعہ ہے۔ جس میں فراست نے زندگی اور معاشرے کے بہت سے اُن چھوئے گوشوں کو بے نقاب بھی کیا ہے اور شعری جمالیات کی ایک نئی دنیا سے اردو رباعی کے قاری کو روشناس بھی کرایا ہے۔ فراست ایک پڑھے لکھے، زیرک اور صحبت یافتہ شخص ہیں۔ جدید علوم سے بھی کماحقہٗ واقف ہیں، اسی لئے اُن کی رُباعیات میں فرسودگی کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ اُن کی آواز اور نفسِ مضمون دونوں میں ایک نوع کی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ اُن کا حیطۂ بصیرت بہت علم مدار اور وسیع ہے۔ وہ عروض کے اسرار و رموز سے بھی شناسائی رکھتے ہیں۔ اُن کی رُباعیات میں ایک عجیب سی حسن کاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا طرزِ بیان بہت پختہ اور سحرناک ہے۔ اُنھوں نے مناظرِ فطرت کا جو نقشہ اپنی رُباعیات میں کھینچا ہے، وہ بہت دل فریب ہے۔ فراست کے اِس مجموعۂ رُباعیات میں اور بہت کچھ قابلِ توجہ ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں محض چند گوشوں پر ہی بات کی ہے۔ اس میں مابعد جدیدیت اور ساختیاتی فکر کو بھی رُباعیات کا موضوع بنایا گیا ہے۔ آگ اور الفاظ کے موضوع پر اور لکھنؤ کی یاد میں لکھی گئی رُباعیاں بھی بہت جان دار اور دل کش ہیں۔

مختصر یہ کہ اساتذہ نے رُباعی گوئی کے جتنے تقاضے اور شرائط بیان کی ہیں، فراست رضوی اُن سب پر پورے اُترتے ہیں۔ یعنی علم، اظہار پر قدرت، شعری جمالیات کا لحاظ، عروض پر گرفت، زبان دانی اور رُباعی کا چوتھا مصرع لکھنے کا سلیقہ۔ میرا فراست کو مشورہ ہے کہ وہ رُباعیات لکھنے کے اس کارِ احسن کو جاری رکھیں، کیوں کہ اس وقت اچھی رُباعیات لکھنے والے شعراء ناپید ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ صاحبانِ فکر اور اربابِ ذوق اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے اور فراست رضوی اتنے شان دار مجموعۂ رباعیات پر لائقِ تحسین ہیں۔

☆☆☆☆☆

کتاب۔ قصہ نصف صدی کا

شاعر۔ اشرف عباس

سن اشاعت: ۲۰۱۸

# ایک رثائی آواز

## علامہ طالب جوہری

آج کراچی کی عزاداری میں شریک ہونے والا ایسا کون سا شخص ہے جو جناب اشرف عباس کے اسم گرامی سے واقف نہ ہو یا ان کی خدمات کا معترف نہ ہو۔ میں نے کراچی کا ذکر اس لئے کیا کہ موصوف کا بنیادی حوالہ یہی شہر ہے۔ ورنہ ابلاغ کے ذرائع ان کی آواز اور ان کے نام کو دنیا کے ہر اس مقام تک پہنچاتے رہے ہیں جہاں آلِ محمد علیہم السلام کا چاہنے والا اردو داں طبقہ موجود ہے۔

ناصر جہاں مرحوم کی رثائی آواز کے علاوہ یہ دوسری زندہ رثائی آواز ہے۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ رثائیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسے لحن کا انتخاب جو رثائیت کو چار چاند لگا دے۔ اس کے ساتھ ہی لفظوں کی ایسی ادائیگی کہ سامع پر شعر کی مکمل ترسیل ہو جائے۔ اشرف عباس کا وہ طریقہ ہے جو محافل، مشاعرے اور مجالس میں سلام خوانی تک ہر جگہ مرغوب و مطلوب ہے۔

کم لوگ ایسے ہوں گے جنہیں یہ معلوم ہوگا کہ وہ ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ایک اچھے شاعر بھی ہیں اور مشق و مہارت نہ ہونے کے باوجود وقتِ ضرورت سلام کہہ لیتے ہیں۔ انہیں شعری مزاج وراثت میں ملا ہے ان کا گھر شعراء کا مرکز تھا۔ جہاں میں نے ذاتی طور پر انہیں اکابر شعراء کا کلام پڑھتے سنا ہے، کچھ واقعات ان کی تحریر میں بھی موجود ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ چند سال قبل دبئی میں ان کی قیام گاہ پر میں نے ان سے اپنی یادداشتوں کو مرتب کرنے کی فرمائش کی تھی اور انہوں نے قبول بھی فرمایا تھا۔

اگرچہ موجودہ تحریر بھی ایک دلچسپ مواد کی صورت لئے ہوئے ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اشرف

عباس صاحب کے سینے میں اس سے کئی گنا زیادہ مواد موجود ہے، ان کے صاحبزادے مشرف عباس اگر اسے مرتب کرا سکیں تو یہ ان کی سعادت مندی ہوگی۔

رجب ۱۳۸۳ ہجری

☆☆☆☆☆

maablib.org

# یادداشت

maablib.org

MAAB 1431
maablib.org

# علامہ طالبؔ جوہری

## تصنیفات و شعریات:

### نثری سرمایہ

| کتاب | موضوع | کتاب | موضوع |
|---|---|---|---|
| ۱) احسن الحدیث (دو جلدیں) | تفسیر قرآن | ۵) خلفائے اثنا عشر | حدیث |
| ۲) حدیثِ کربلا | مقتل | ۶) اسلامی معیشت کے رہنما اصول | اصول معاشیات |
| ۳) عقلیاتِ معاصر | منطق و فلسفہ | ۷) حدیثِ کساء | ترجمہ حدیثِ کساء |
| ۴) علاماتِ ظہورِ مہدی | امامِ زمانہ | ۸) عقلیاتِ اسلامیہ (زیرِ طبع) | علم کلام |

### شعری سرمایہ

شعری مجموعے: (۱) حرفِ نمو (۲) پسِ آفاق (۳) شاخِ صدا (۴) چوتھا مجموعہ کلام (زیرِ طبع)

دو مرثیے: (۱) وجودِ باری تعالیٰ (۲) ہدایت۔ سلام، مناقب و قصائد (زیرِ طبع)

علامہ طالبؔ جوہری پر لکھی جانے والی کتابیں۔ (۱) علامہ طالبؔ جوہری کے شعری افق۔ (۲) شعریات علامہ طالبؔ جوہری

### عشرۂ مجالس

(۱) تہذیبِ نفس اور تہذیبِ حاضر (۲) میزانِ ہدایت اور قرآن (۳) حیات و کائنات کا الوہی تصور

(۴) عالمی معاشرہ اور قرآنِ حکیم (۵) اساسِ آدمیت اور قرآن (۶) میراثِ عقل اور وحیِ الٰہی

(۷) انسانیت کا الوہی منشور (۸) نظامِ حیاتِ انسانی (۹) علم و عقیدہ

(۱۰) دین و شریعت کی عقلی تعبیر (۱۱) انسانِ معاصر اور قرآن (۱۲) اساسِ علم اور کتابِ الٰہی